UNIVERSAL LIBRARY

OU_226482

UNIVERSAL LIBRARY

حقیقتِ عالم

(چوہدری محمد عبدالرحمٰن)

حقیقتِ عالم

(چودھری) محمد عبدالرحمٰن

دیباچہ

اس وقت دنیا ایسے دور سے گذر رہی ہے۔ جو اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اگر نسل انسانی کے باہمی جھگڑے فساد کی یہی صورت رہی جو تقریباً ایک سو سال گذشتہ سے رہی ہے۔ تو نئے تباہ کن آلات سے جو سائنس نے انسان کے ہاتھوں میں دے دیئے ہیں غالب ہے کہ نسل انسانی ہی ختم ہو جائے۔ اگر انسان نے باقی رہنا ہے تو ضروری ہے کہ اسے ایسی علمی روشنی حاصل ہو جس سے نسلی، قومی، وطنی، مذہبی نفرتوں اور تعصبوں کی کالی گھٹائیں دور ہو جائیں اور انسان امن و اطمینان اور اخوت و محبت کی زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ اس میں انسان سے متعلقہ تمام اہم مسائل حقیقت عالم، ارتقاء، روح، مجرد، نیکی بدی، ترقی تنزل، موت حیات، تقدیر، خدا، رسول اور مقصد کائنات وغیرہ پر خالص علمی پیرایہ میں بحث کی گئی ہے۔ اور مادہ کے ابتدائی ذرہ سے لے کر ساری کی ساری کائنات سے وحدت انسانی پر شہادت پیش کی گئی ہے۔

محلہ ریزیڈنسی (جموں)
۱۴ اپریل ۱۹۴۲ء

خاکسار
(چودھری) محمد عبدالرحمن
اسسٹنٹ سیکرٹری ہز ہائینس گورنمنٹ جموں و کشمیر (انڈیا)

۱۔ مطالعۂ نفس کی دعوت

۱۔ انسان جب اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالتا ہے۔ تو کثرتِ نظارہ سے دریائے حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔ اور بے اختیار پوچھتا ہے۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں　　ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کدھر جاتا ہے؟ یہ سوالات انسان کے دل میں اٹھتے اور اسے پریشان کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ان سوالوں سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ سوالات انسان کے اندر اٹھتے کیوں ہیں؟ ایک اور سوال جس سے آخری سوال کے حل کرنے میں مدد ملے گی۔ یہ ہے کہ سوالات جو انسان کے دل میں اٹھتے ہیں۔ ان کا مخاطب کون ہے؟ انسان یہ سوالات کس سے پوچھتا ہے؟ کیا زمین سے پوچھتا ہے؟ پہاڑوں اور دریاؤں سے پوچھتا ہے؟ ہوا سے پوچھتا ہے؟ ستاروں سے پوچھتا ہے؟ گائے اور بھینس سے اپنا جواب پانے کی توقع رکھتا ہے۔ جواب اگر کوئی ملتا ہے۔ تو کہاں سے ملتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اچھا یا برا۔ غلط یا صحیح جواب ملتا ہے انسان ہی سے ملتا ہے۔ تو انسان جو کچھ پوچھتا ہے۔ اپنے آپ سے پوچھتا ہے اور اپنے

آپ سے ہی جواب پاتا ہے۔ سوال اور جواب دونوں انسان کے اندر پنہاں[١] ہیں۔ سوال کا باعث وہی جواب ہے جو انسان کے اندر مخفی ہے۔ جب حسن مائل ظہور[٢] ہوتا ہے تو اپنی ذرا سی جھلک دکھا دیتا ہے۔ یہ جھلک اندھیری رات میں روشنی کی ایک کرن کی طرح ہوتی ہے۔ ناظر کو فقط اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کچھ دیکھا ہے پر معلوم نہیں ہوتا کہ کیا دیکھا۔ اس جھلک سے حسن کا مقصد اپنی تلاش اور اپنا عشق پیدا کرنا ہوتا ہے چنانچہ ناظر اس نظارہ کو دوبارہ اور پھر ہو کر دیکھنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔ جب ناظر اپنے آپ کو تلاش حسن میں کھو دیتا ہے اور مجسم عشق بن جاتا ہے تو حسن اپنے پورے جوبن میں بصد ناز و ادا جلوہ گر ہوتا ہے۔

عاشق باید[٣] کہ بردارد از پیش نقاب

حسن کے اقتضائے ظہور[٤] سے عشق پیدا ہوتا ہے اور پھر عشق حسن کی نقاب کشائی[٥] کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر انسان کے اندر جواب نہ ہوتا اور وہ جواب اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا خواہاں نہ ہوتا تو سوال نہ ہوتا۔ سوال اس جواب کا جو انسان کے اندر ہے ذرا سی جھلک ہے۔ اور اس جھلک سے اس کا مقصد اپنی طلب و تلاش پیدا کرنا ہے۔ تاکہ سوال ہو تو وہ جواب کی شکل میں ظاہر ہو۔ طلب و تلاش ہو تو

---

١ چھپا ہوا ٢ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا خواہشمند ٣ جب تک عاشق نہ ہو معشوق اپنا پردہ نہیں اٹھاتا ٤ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی خواہش ٥ پردہ اٹھانا۔

وہ مطلوب کی صورت میں جلوہ گر ہو۔ سوال اور جواب ایک چیز ہیں دو نہیں۔ سوال جس چیز کی ذرا سی جھلک ہے جواب اُسی چیز کا پورا ظہور ہے۔ دیکھ لیجئے جب ہم کسی چیز کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس کو سوال کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ہمارا مقصد مخاطب میں ..... جواب سننے کا شوق پیدا کرنا ہوتا ہے۔ پھر جب ہم اسے جواب کا مشتاق پاتے ہیں اپنا مطلب بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ سوال اظہار مدعا کا پہلا قدم یا اس کا مجمل[1] بیان ہے۔ آگے جو جواب آتا ہے وہ اس اجمال کی تفصیل ہے۔ سو انسان کے دل میں سوال کا اٹھنا جواب بیان کرنے کی تمہید[2] ہے۔ یوں سمجھئے کہ جب انسان کہتا ہے کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے تو اس کے اندر سے جو چیز سوال کرا رہی ہے واقع میں اس کا منشا یہی ہے کہ آؤ مجھ سے پوچھو کہ یہ کیا ہے اور وہ کیا ہے:

پس سوال جو ہمارے دل میں اٹھتے ہیں وہ مطالعہ نفس کے لئے ہمارا بلاوا ہیں یعنی یہ معلوم کرنے کے لیے کہ انسان کیا ہے؟

۲- انسان

اتفاق یا ارادہ؟ ہمارے حکماء نے انسان کی کئی تعریفیں کی

لہ تفسیر ۱۲ نیازی

ہیں۔ بعض نے اسے حیوان ناطق[3] کہا ہے بعض نے سماجی جانور بعض نے جزئیات[4] سے کلیات کا تصور کرنے والا اور بعض نے اس کی صنعت و ایجاد کو خاصہ انسانی قرار دیا ہے۔ ان تمام تعریفات میں حیوان اور انسان کو ایک جنس مان کر ان میں فصل[5] یا وجہ امتیاز تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تعریفوں میں جو وجوہ امتیاز مانی گئی ہیں وہ بڑی حد تک درست ہیں اور ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں لیکن ان میں کوئی بھی ایسی نہیں جو صرف انسان میں پائی جاتی ہو اور باقی جانداروں میں مطلقاً[6] مفقود ہو۔ ان صفات میں سے ہر صفت کا مادہ کسی نہ کسی درجہ پر اور کسی نہ کسی شکل میں حیوان میں بھی پایا جاتا ہے۔ اسی لئے حال کی تحقیقات میں انسان کو ترقی یافتہ حیوان مانا گیا ہے۔ یہ تعریف بمقابلہ دوسری تعریفوں کے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور اس کا میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ جائزہ لوں گا

میری رائے میں کوئی چیز ترقی کر کے اپنی حد سے آگے نہیں جا سکتی۔ ارتقا کا سلسلہ نہ صرف حیوان و انسان میں پایا جاتا ہے بلکہ جمادات، نباتات اور انسان ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور ہر کڑی اپنے اندر گذشتہ کڑیوں کو

---

[3] چیزوں کو سمجھنے اور بیان کرنے والا [4] مثلاً افراد انسانی پر غور کرکے انسانیت کا جس کی وجہ سے انسان انسان کہلاتا ہے تصور کر لینا۔ افراد جزئیات ہیں اور انسانیت کلی [5] فرق [6] بالکل نہ پائی جائے ﴿

شامل رکھتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ کڑیوں کے خواص انسان
میں موجود ہیں۔ سچ یہ ہے کہ انسان کئی مراتب سے گذر کر آیا
ہے۔ اور ہر مرتبہ پر انسان انسان ہی تھا فرق صرف قوۃ[1]
اور فعل[2] کا تھا۔ انسانیت جو اس وقت اس میں ظاہر ہے
مراتب سابقہ میں اس کے اندر پنہاں[3] تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آگے
چل کر وہی خاص حیوان انسان بنا جس میں انسان بننے کی استعداد ہر مرتبہ
میں مخفی چلی آئی تھی۔ یہ نہیں کہ ہر حیوان ترقی کر کے انسان
بن جائے اگر ایسا ہوتا تو انسان کے پیدا ہو چکنے کے بعد بھی
کوئی نہ کوئی نوع حیوان ترقی کر کے انسان بن چکی ہوتی۔ اگر
حکماء مغرب کی پیروی کر کے یہ کہا جائے کہ انسان کے پیدا
ہو چکنے کے بعد کسی نوع حیوان نے ایسی کوشش نہیں کی
جو انسان بننے کے لئے ضروری تھی یا یہ کہ ماحول[4] جس
میں ایسی تبدیلی ممکن تھی میسر نہیں آیا تو اس سے میرے
ہی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ کسی نوع نے کیوں ایسی کوشش
نہیں کی جس سے وہ انسان بن جاتی؟ اس لئے کہ اس
میں ایسی کوشش کی صلاحیت موجود نہ تھی۔ جو سعی مطلوبہ
کی محرک ہوتی۔ اور جس کے نتیجہ میں وہ نوع حیوان انسان
بن جاتی۔ باقی رہا یہ کہ مناسب فضا اور ماحول میسر نہیں
آئے۔ تو یہ زبردستی ہے یا حد درجہ کی سادگی۔ مناسب فضا

۱؎ مخفی استعداد جو ابھی ظاہر نہیں ہوئی ۲؎ ظہور میں آنا ۳؎ چھپی ہوئی ۴؎ ماحول اردگرد [illegible]

وماحول کے بغیر ہو سکنا کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا، کہ موجودہ فضا اور ماحول میں انسان زندہ رہ رہا ہے، اگر وہ ماحول جس میں انسان وجود میں آیا تھا، اس کے وجود میں آچکنے کے بعد باقی نہ رہتا، تو انسان جو پیدا ہو چکا تھا، وہ بھی ناموافق ماحول میں فنا ہو جاتا۔ موجودہ ماحول میں انسان کا وجود اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ انسان کے مناسب حال فضا اور ماحول باقی ہے۔

دوسرے اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے۔ کہ انسان کے پیدا ہو چکنے کے بعد کسی نوع حیوان نے مناسب سعی[1] کی ہے اور نہ ہی مناسب فضا اس کو میسر آئی ہے کہ جس سے وہ انسان بن سکتی تب بھی یہ سوال جوں کا توں باقی رہتا ہے کہ کیوں ایسے داخلی اور خارجی اسباب[2] بعد میں میسر نہیں آئے۔ اور کیوں انسان کی پیدائش کے وقت وہ میسر آ گئے؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اس وقت ان اسباب کا جمع ہو جانا اتفاق محض تھا۔ لیکن یہ اتفاق ایک دفعہ نہیں ہوا بلکہ قدم قدم پر ہوتا آیا ہے۔ زندگی جب پیدا ہوئی اس وقت بھی مناسب عناصر اور مناسب فضا کا اتفاق مانا جاتا ہے جس سے بے جان مادہ میں زندگی رونما ہو گئی،

---

[1] کوشش [2] اندرونی اور بیرونی

اس کے بعد زندگی میں جو ترقی ہوتی رہی وہ بھی اسی طرح مانی جاتی ہے کہ اتفاقاً ایک نوع نے ایسی سعی شروع کر دی جس سے اس کی شکل و صورت میں تبدیلی آگئی اور وہ ایک نئی ترقی یافتہ نوع بن گئی۔ پھر جب انسان بنا اس وقت بھی اتفاق سے ایسی نفث میسر آگئی کہ ایک نوع حیوان انسان میں تبدیل ہوگئی۔

ان حکماء کے انداز پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اتفاق سے یہ "اتفاق" اتنا ہوشیار اور اپنے مطلب کا پکا واقع ہوا ہے کہ جب دیکھتا ہے کہ ایک نوع اپنی حد کے اندر جو ترقی کر سکتی تھی کر چکی ہے تو اسے دوسری نوع میں بدلنے کو آموجود ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر کبھی غیر حاضر نہیں ہوتا۔ پھر ایک نوع کو دوسری میں بدلتے وقت ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہے کہ قدم آگے کو پڑے نہ کہ پیچھے کو۔ اس "اتفاق" کے پیش نظر ترقی عالم کا مقصد ہے۔ اور یہ مقصد اس قدر ظاہر ہے کہ حکماء موصوف کو بھی بے ساختہ اس کا اقرار کرنا پڑا ہے۔ یہاں تک انھوں نے رفتار عالم کا نام ارتقاء رکھا ہے جس کے معنی تدریجی ترقی ہیں اور جو تنزل کی ضد ہے۔ یہ کہنا کہ عالم کی حرکت ایک خاص سمت[1] میں طور معین[2] راستے پر ہے جو شاہراہ

[1] طرف ۔ [2] مقررہ ۔

ترقی ہے۔ اس سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتی۔ حرکت کے با مقصد ہونے کا اعتراف کرنا ہے۔ اگر حرکت کے پیشِ نظر کوئی خاص مقصد ہے تو وہ اتفاقی نہیں ہو سکتی۔ اتفاق تو کہتے ہی اس چیز کو ہیں جس میں کوئی مقصد نہ پایا جائے۔ غرض ایک طرف ارتقاء کا قائل ہو کر حرکت میں مقصد کا اقرار[۱] کرنا اور دوسری طرف اسے اتفاقی محض کا نتیجہ بتا کر اس کے بے مقصد ہونے کا اعلان کرنا اجتماعِ ضدین ہے جو محال[۲] ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ انسان کسی حیوان کی اتفاقی ترقی کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ارادہ سے اختیار کی گئی نہایت وسیع دور رس۔ اور کامیاب تدبیر کا ثمرہ ہے۔

انسان میں ارادہ کا ظہور

نہ صرف مظاہرِ عالم میں اور انسان کی ظاہری اور باطنی ساخت میں ارادہ اور تدبیر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ انسان خود صاحبِ ارادہ و تدبیر بھی ہے۔ کوئی چیز عدمِ محض[۳] سے برآمد نہیں ہو سکتی کسی چیز کے پیدا ہونے کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ جیسے وہ مخفی تھی بعد میں ظاہر ہو گئی۔ زندگی جو نباتات میں ظاہر ہے بے جان مادہ میں مخفی تھی اگر بے جان مادہ

۱؎ اقرار کرنا۔ ماننا۔ ۲؎ ناممکن۔ ۳؎ خالص نیستی

میں وہ جوہر نہ ہوتا جس نے آگے چل کر زندگی کی شکل اختیار کی تو نباتات میں زندگی کا ظہور ناممکن ہوتا۔ اسی طرح ارادہ اور تدبیر جو انسان میں پائے جاتے ہیں ضروری ہے کہ انسان میں ظاہر ہونے سے پہلے حیوان میں اور اس سے پہلے نبات میں اور اس سے پہلے بے جان مادہ میں مخفی چلے آتے تھے۔

پُر اسرار اصل عالم

عالم ۹۲ عناصر سے بنا ہے ہر عنصر کا ابتدائی ذرہ مثبت اور منفی بجلی کی برابر برابر اکائیوں کا الگ الگ نظام ہے۔ ۹۲ عناصر کی مختلف ترکیبوں سے کروڑوں چیزوں کا وجود میں آجانا تو سمجھ میں آسکتا ہے لیکن ایک ہی جنس کے مادہ کے مختلف ذرات کی کئی اجناس بن جانا ایسا معما ہے جو انسان کی عقل و فکر سے باہر ہے۔ ایک طرف انسان مجبور ہے کہ عالم میں کئی عناصر مانے۔ دوسری طرف جب وہ ان کی تہ میں پہنچتا ہے تو پاتا ہے کہ سب کی اصل ایک ہے۔ ایک ہی چیز سے بانوے چیزیں کیوں کر بن گئیں۔ یہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتا آخر مجبور ہوکر اسے کہنا پڑتا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ کیوں کر بنیں بس اتنا جانتا ہوں کہ بن گئیں ارادہ تھا کہ بن جائیں سو بن گئیں۔

ارادہ کے ظہورات

روز مرہ تجربہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کی ابتداء ارادہ ہے سب سے پہلے ارادہ ہوتا ہے پھر تدبیر ہوتی ہے

پھر تدبیر بر عمل ہوتا ہے۔ آخر پر مراد جو ارادہ میں مرکوز تھی حاصل
ہوتی ہے جب تک ارادہ نہیں ہوتا مراد کا نام ہوتا ہے نہ نشان
تدبیر ہوتی ہے نہ جد و جہد۔ جونہی کہ ارادہ ظہور کرتا ہے راستہ
بھی نکل آتا ہے۔ اور راستہ طے کرنے کی طاقت بھی۔ ارادہ ہی تدبیر
اور قوت عمل مہیا کرتا ہے۔ اور ارادہ ہی صحت عمل کی نگرانی
کرتا ہے۔ دوران عمل میں اگر کوئی قدم غلط اٹھ جائے تو ارادہ
فوراً درستی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور غلط قدم کو مٹا کر صحیح
قدم اٹھاتا ہے اسی طرح لگاتار سرگرم عمل رہتا ہے۔ یہاں
تک کہ مراد حاصل ہو جائے۔ جب تک مراد حاصل نہ ہو ارادہ
اطمینان نہیں پاتا۔ ارادہ کے لئے ناکامی عار[1] ہے جو وہ کبھی
برداشت نہیں کر سکتا۔ ناکامی جب ہوتی ہے ارادہ کے نہ ہونے
سے ہوتی ہے۔ خوب غور کر کے دیکھو جب جب ناکامی ہوئی ارادہ
کی کمزوری یعنی صحیح معنوں میں ارادہ کے فقدان[2] سے ہوئی۔ ارادہ
اور امنیت میں فرق ہے امنیت آرزوئے خام کو کہتے ہیں جس
کا دامن مراد سے خالی ہے۔ بخلاف اس کے ارادہ صحیح و سالم بیج
ہے جس میں مراد مع اپنی فروعات کی ہر چیز کے ٹھیک اسی طرح مخفی اور
منتظر ظہور ہے جیسے بیج میں پھل مع تنہ شاخ پھول کے
مخفی اور ظہور کے انتظار میں ہے۔ تدبیر قوت عمل اور حاصل تدبیر
ارادہ کے ہی ظہورات ہیں جب وہ خستہ [illegible] کی طرف متوجہ ہو [illegible] ذیل

---

[1] قدم [illegible] کے نہ ہونے سے [illegible]

بیج کے ظہورات ہیں۔ ان ظہورات کی مثال بعینہٖ دائیرہ اور
دائیرہ کے نقطہ کی مثال ہے۔ دائیرہ کا پہلا اور آخری نقطہ
ایک ہی ہے۔ وہی ایک نقطہ حرکت کر کے دوسرا نقطہ کہلاتا ہے اور
پھر مزید حرکت کر کے تیسرا اور چوتھا یہاں تک کہ اخیر پر پہنچ
کر خود ہی آخری نقطہ بھی ہوتا ہے اور پہلا بھی۔ نقطہ کے پیش
نظر اپنے آپ کو ظاہر کرنا تھا یعنی نظر بہ سے دیکھنا کہ اگرچہ میں
ایک ہوں میرے ظہورات بے شمار ہیں۔ اور اگرچہ میرے
ظہورات بے شمار ہیں ان ظہورات کی حقیقت ایک ہی ہے
وحدت میں کثرت پنہاں ہے۔ اور کثرت میں وحدت کا ظہور

منبع عالم

۔ عناصر کی تحقیقات سے اتنا تو معلوم ہو
چکا ہے کہ ان کی اصل ایک ہے اگرچہ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ
وہ ایک اصل کیا ہے؟ حکما جب یہ معلوم کر لیں گے کہ وہ کیا
ہے دیکھا جائے گا۔ سر دست جو کچھ اوپر بیان ہوا
اُس کی روشنی میں میں اسکا نام ارادہ رکھتا ہوں جو فعال
مطلق ہے اور عالم کو ایک وسیع اور دور بیں تدبیر خیال کرتا ہوں
جو ارادہ ہی کا ظہور ہے۔ وہ مراد جو ارادہ میں مرکوز تھی جس کی خاطر
یہ وسیع تدبیر اختیار کی گئی اور جس کی خاطر عالم وجود میں آیا
انسان ہے۔ دوسرے لفظوں میں عالم ایک درخت ہے جس کا

سہ۔ جو چاہے کر ڈالنے والا ۔ سہ چھپی ہوئی تھی ۔

نیچر ارادیت اور پہیلی انسان'، صفحہ ۱۲۱ پر اصل عالم
کی جو پراسرار شان ملاحظہ کی گئی ہے۔ اس کی رو سے انصاف
کا تقاضا یہی ہے کہ اسے مادہ یا بجلی کا نام نہ دیا جائے کیونکہ
مفرد مادہ ۹۲ عناصر نہیں بن سکتا۔

سوال ہوگا کہ ارادہ اپنا مستقل وجود نہیں رکھتا صاحب
ارادہ کون ہے! اور کہاں ہے؟ اس کا ایک مختصر جواب تو یہ
ہے کہ صاحب ارادہ انسان ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ انسان
کے ظہور سے پہلے کون صاحب ارادہ تھا؟
تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بھی صاحب
ارادہ موجود تو تھا، مگر مخفی تھا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ آگے
چل کر وہی چیز ظاہر ہوتی ہے جو ظہور سے پہلے مخفی تھی،
عدم محض سے کچھ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ میں
اس بات کے اقرار میں بھی کوئی شرم محسوس نہیں کرتا کہ
ہرچند میری عقل چاہتی ہے کہ ارادہ کے پیچھے صاحب ارادہ
ضرور ہونا چاہیے، مجھے اس کا سراغ نہیں ملا، وہ میرے
عقل و فہم کی دسترس سے باہر ہے۔ کہتے ہیں، دریائے
چناب کا منبع باوجود کوشش کے معلوم نہیں
ہو سکا، کم از کم مجھے دریائے چناب کا
منبع دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دریا میں نے
کئی بار دیکھا ہے۔ جس طرح دریائے چناب
کا منبع معلوم نہ ہو سکنے کی بنا پر دریائے

حیات کا انکار نہیں ہو سکتا، اسی طرح صاحب ارادہ کے نظر نہ آنے کی بنا پر ارادہ کا جو سمت سے ہے انکار نہیں ہو سکتا۔ انسان کے صاحب ارادہ کو نہ سمجھ سکنے لیکن اس کے اقرار پر مجبور ہونے اور اسکی معرفت ممکن اور طریق کا مفصل بیان آگے آئیگا

کثرت کا دھوکا شجر عالم جو ارادہ کے بیج سے پھوٹا بڑھا اور پھیل گیا (مکان و زمان دونوں اس کے پھیلاؤ کا نام ہیں اور اس کو ماپنے کے پیمانے) اپنے پھیلاؤ کے قدم قدم پر نیا رنگ اختیار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی وحدت اس کے بے انتہا رنگوں کے نیچے دب کر رہ گئی اور دیکھنے والے کو عالم کشمکش حیات[1] کا اکھاڑہ نظر آنے لگا۔

گویا عرصۂ حیات[2] تنگ تھا اور طالبان حیات زیادہ۔ صلاح یہ ٹھہری کہ جو اصلح[3] ہے وہ زندہ رہے۔ اور دوسرے اس کے لئے جگہ خالی کر دیں۔ سوال ہوا کہ اصلح کون ہے؟ جواب ملا جو اپنی ذہانت اور طاقت کی بدولت کمزوروں کو کھا جائے اور خود باقی رہ جائے جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ دوسروں کو جتنا کوئی فنا کرے اتنا ہی زندہ رہنے کا اس کا حق زیادہ ہے۔ جب اپنی زندگی کا مدار دوسروں کو فنا کرنے پر آ رہا تو اپنی زندگی کا کون دشمن تھا کہ دوسروں کو فنا کرنے میں کسر اٹھا رکھتا۔ آپس کی جنگ کی تلقین[4] کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ حیوانات و نباتات پر تو اس کا اثر کیا ہونا تھا انسان خاص کر اس سرزمین کا انسان جہاں یہ فلسفہ پیدا ہوا انسانیت

---

۱ زندگی کی جنگ ۲ زندگی کا میدان ۳ جسمیں زندہ رہنے کی قابلیت سب سے زیادہ ہو ۴ سبق

سے عاری ہو کر درندہ بن گیا۔ نہیں نہیں اس کو درندہ کہتے ہیں درندہ کے ساتھ بے انصافی ہے۔ درندہ بیچارا تو صرف اس وقت شکار کرتا ہے جب بھوکا ہو۔ اور اس وقت بھی اپنی جنس کو چھوڑ کر غیر جنس کے جاندار کو۔ اس نام نہاد انسان نے اپنے ہم جنسوں پر بھوک کی وجہ سے نہیں محض اپنا حق حیات ثابت کرنے کے خبط[1] میں ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا اور اس میں وہ کمال دکھایا کہ ساری دنیا کو اپنے سمیت جہنم میں جھونک دیا۔

کیا اس وسیع خونریزی سے پہلے تاریخ انسانی میں اس عالم گیر خونریزی کی کوئی مثال ملتی ہے۔ جو تیس سال کی قلیل مدت میں دو بار ہم اپنی آنکھوں سے خود دیکھ چکے ہیں جب خونریزی قدرت کا دیا ہوا پیدائشی حق ہی نہیں بلکہ قدرت کا عاید کیا ہوا نہ ٹلنے والا فرض منصبی سمجھی گئی ہے۔ اور بجائے شرمناک فعل ہونے کے معیار عزت قرار پائی تو یہ خونی کھیل اس وقت نہ کھیلا جاتا تو اور کس وقت کھیلا جاتا؟

ممکن ہے بعض احباب کے دل میں سوال پیدا ہو کہ آیا انواع حیوان کے طبعی تفاوتوں کے مطالعہ انکے ردیہ اور مختلف انواع کے وجود میں آنے اور دوسری انواع کا شکار ہو جانے کی تاریخی روشنی میں بھی نظریہ پیکار باہمی[2] کو غلط بتایا جا سکتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اگر ناظرین کرام میرے مضمون کو اول سے آخر تک بغور مطالعہ فرمائینگے

---

[1] وحشت ۔ [2] آپس کی جنگ ۔

اور میرے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں دلچسپی لیں گے تو ایسے سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔ بلکہ پیدا ہی نہ ہوں گے۔ سر دست اتنا یاد رکھیں کہ نظریہ پیکار انفرادی یا نوعی حیات کی بنا پر تعمیر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ افراد یا انواع ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہیں اور ایک کا مفاد دوسرے کے مفاد کے خلاف ہے اگر انفرادی اور نوعی حیات کی بجائے یہ ثابت ہو جائے کہ زندگی کل ایک ہے جو تقسیم پذیر نہیں اور افراد اور انواع سب اس ایک زندگی کے مظاہر[1] ہیں۔ تو نظریہ پیکار کی دونوں ٹانگیں جو کثرت حیات اور اختلاف مفاد ہیں ٹوٹ جانے کے بعد نظریہ پیکار کیونکر کھڑا رہ سکے گا؟ اس وقت پیکار اگر کوئی ہوئی تو اس کے اسباب از سر نو تلاش کرنے ہوں گے اور انشاء اللہ اپنے موقعہ پر اس چیز کا جائزہ لیا جائے گا۔

انسان جوہر ترقی | سارا عالم ایک اور صرف ایک درخت ہے اگرچہ اس کی شاخیں اس کے پتے اس کے پھول بے شمار ہیں اس کی جڑ یا اس کی حقیقت ایک ہے۔ اس حقیقت کا پہلا ظہور بے جان مادہ کی شکل میں ہوا۔ آگے چل کر اس حقیقت نے نباتی زندگی کی صورت اختیار کی۔ نباتی زندگی سے ترقی کر کے حیوانی مرتبہ پر پہنچی اور وہاں سے مزید ترقی کر کے انسان کہلائی انسان نہ حیوان ہے نہ نبات، نہ جماد بلکہ انسان اس

---

[1] ظاہر ہونے کی جگہ۔

حقیقت کا نام ہے جسے جوہر ترقی کہنا چاہیے جس کے سفر ترقی میں جماد، نبات اور حیوان مختلف منازل ہیں۔ یا یوں کہو کہ جمادات نباتات حیوانات مختلف اجسام تھے جو یہ روح ترقی یکے بعد دیگرے اختیار کرتی اور ترک کرتی رہی جب یہ روح ترقی جمادات میں پنہاں تھی جمادات ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ وہ نباتاتی درجہ تک پہنچی جب اس روح نے نباتات کا جامہ اختیار کیا تو جمادات کی مزید ترقی رک گئی اور نباتات ترقی کرنے لگیں اور جب تک روح ترقی نباتات میں رہی نباتات مسلسل ترقی کرتی چلی گئیں۔ جونہی کہ روح ترقی نے جو نباتات میں مخفی اور اس کی ترقی کا موجب تھی نباتاتی جامہ ترک کر کے حیوانی شکل اختیار کی نباتات کی مزید ترقی ختم ہو گئی اور حیوان ایک نوع سے دوسری نوع میں ترقی کرنے لگا۔ اور حیوانی ترقی کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک حیوان کو روح ترقی کی صحبت کا شرف حاصل رہا۔ جب روح ترقی نے حیوانی درجہ کو خیرباد کہہ کر انسانی شکل میں ظہور فرمایا تو حیوانی ترقی خاتمہ کو پہنچ گئی اور انسان ترقی کرنے لگا۔ انسان نے اپنی پیدائش کے وقت سے اس وقت تک جو ترقی کی ہے اس سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے انواع حیوان آج بھی ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں وہ انسان کی پیدائش کے وقت تھے جو چیز انسان کو حیوان اور دوسری مخلوقات سے ممتاز کرنے والی ہے وہ ترقی ہے۔ میرے نزدیک حقیقت انسانیہ ایک حرکت پیہم ہے۔ جو ہمیشہ جاری ہے اور جب جب اور جس جس

چیز کو اس نے اپنا مرکب[۱] بنایا اسے شاہراہِ ترقی پر ڈال رکھا اور جس جس چیز کو اس نے جہاں جہاں چھوڑا وہ وہیں کی وہیں رہ گئی اور یہ آگے نکل گئی۔ انسان کے سوا تمام کائنات اس حرکت کے نقوش پا[۲] ہیں۔ جو اس کے وہاں سے کبھی ہو گذرنے کا پتہ دیتے ہیں۔ اس لئے میں انسان کی تعریف " جوہر ترقی" کے الفاظ سے کرتا ہوں اور انسان کو اپنی موجودہ شکل و صورت میں ترقی مجسم سمجھتا ہوں۔

انسان کا تعلق عالم سے

" بیج کا جوہر جو اخیر پر پھل بننے والا ہے بیشک تنہ سے شاخوں سے اور پھولوں سے ہو کر گذرتا ہے۔ لیکن نہ وہ تنہ ہے نہ شاخ نہ پھول چنانچہ جب پھل لگتا ہے تو وہ تنہ شاخوں اور پھولوں سے اتنا نرالا ہوتا ہے کہ اسے ایک بالکل نئی چیز کہنا پڑتا ہے۔ کیا یہ آم کے تنہ کی سخت لکڑی ہے جو آم کے نرم اور شیریں گودے میں تبدیل ہو گئی ہے؟ یا کیا یہ گلاب کی جھاڑی کا کانٹا ہے جو نہایت خوبصورت ملائم اور خوشبودار پھول بن گیا ہے؟ ہرگز نہیں۔ واقع یہ ہے کہ بیج میں وہ چیز بھی مخفی تھی جس سے آگے چل کر تنہ بنا وہ چیز بھی جس سے کانٹے اور پتے بنے۔ وہ بھی جس سے پھول بنا اور وہی جو پھل بنا۔ تنہ یا پتہ یا کانٹا پھل نہیں بنتا بلکہ وہ چیز پھل بنتی

---

۱ سواری ۔ ۲ پاؤں کے کھوج ۔

ہے جو ابتداء سے پھل بننے والی تھی۔ اور بیج تنہ، شاخ پھول میں چھپی چلی آئی تھی۔ یعنی انسان کو جو شجر عالم کا پھل ہے حیوان کہنا اتنا ہی غلط ہے جتنا تنے کی لکڑی یا پتے کو آم یا کانٹے کو گلاب کا پھول کہنا۔

اگرچہ وہ جوہر جو پھل بنتا ہے اس مادہ سے جس سے باقی درخت بنتا ہے بالکل مختلف چیز ہے لیکن جب یہ جوہر پھل بن جاتا ہے تو سارا درخت جڑھ سے لے کر پھل تک اس میں موجود ہوتا ہے۔ باور[1] نہ ہو تو اس پھل کو بو کر دیکھ لیجیے تنہ شاخ پھول کانٹا پھل سب اس سے برآمد ہو جائیں گے پھل کے جوہر اور باقی درخت کے مادہ میں ایسا تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ نہ بیج میں نہ درخت کی اس حالت میں جب ابھی اس کو پھل نہیں لگا نہ اس وقت جب پھل لگ چکتا ہے۔ اور نہ جب پھل لگ کر درخت سے گر پڑتا ہے تو یہ جوہر نہ درخت سے الگ ہے نہ اس میں ملا ہوا۔ درخت میں ہو کر اور درخت کو اپنے میں رکھ کر درخت سے الگ ہے۔ یہی حال ارادہ کا ہے جو تدبیر میں ظہور کرتا ہے لیکن اس سے مقدس بھی ہے چنانچہ اس کی نگرانی کرتا ہے اور غلط قدم اٹھنے پر اس کی درستی کر دیتا ہے۔ اور ٹھیک یہی صورت حقیقت انسانیہ کی ہے جو سارے عالم سے ہو کر آئی ہے پر کبھی اور کسی مرحلہ پر عالم میں آمیختہ نہیں ہوئی

---

[1] یقین ؛

انسان کل عالم ہے

تو انسان جو شجر عالم کا پھل ہے
عالم کا کوئی حصہ نہیں بلکہ کل عالم ہے

جو غلطی ہم پھل کو باقی درخت سے الگ سمجھنے میں کرتے ہیں وہی غلطی ہم اپنے آپ کو باقی عالم سے الگ سمجھنے میں کرتے ہیں مثلاً میں کہتا ہوں کہ یہ ہاتھ میرا ہے ، یہ پاؤں میرا ہے ، یہ آنکھ میری ہے ۔ اور یہ زبان میری ہے واقعہ یہ ہے کہ اگر میرا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو میں زندہ رہ سکتا ہوں لیکن اگر مجھے قفس سے جس میں میں سانس لیتا ہوں الگ کر دیا جائے تو فوراً ختم ہو جاتا ہوں اگر سورج کی روشنی اور حرارت کو مجھ سے روک دیا جائے یا پانی سے مجھے محروم کر دیا جائے یا زمین جس کے اوپر میں کھڑا ہوں میرے پاؤں کے نیچے سے کھینچ لی جائے تو میں آن کی آن میں فنا ہو جاتا ہوں اس سے معلوم ہوا کہ کرہ ہوائی سورج زمین سمندر غرض عالم کی ہر چیز میرے ہاتھ پاؤں سے بڑھ کر میری اپنی ہے صرف ہاتھ پاؤں اور آنکھ ہی میرے اعضا نہیں بلکہ ساری کی ساری کائنات میرے ہی اعضا ہیں گویا صرف میں اکیلا ہی موجود ہوں اور باقی جو کچھ نظر آتا ہے وہ میرے ہی اعضاء اور اجزاء ہیں ۔ میں مجموعہ عالم ہوں اور کل عالم مجھ میں شامل ہے ۔

یاد رہے کہ انسان عالم کا محتاج نہیں بلکہ عالم کا آقا اور مخدوم ہے ۔ عالم انسان کی طفیل اور اسکی خدمت کے لئے وجود میں

آیا ہے محتاج اسے کہتے ہیں جسے ایک چیز بکار ہو اور وہ
اسے میسر نہ ہو جس کے پاس اس کی ضرورت کی ہر چیز مہیا ہو
اسے محتاج نہیں بلکہ غنی[۵۱] کہا جاتا ہے۔ اس جوہر کو جو درخت
کا پھل بنتا ہے بلاشبہ جڑ، تنہ، شاخ کے ذریعہ غذا پہنچتی ہے
لیکن وہ اُن کا محتاج اس لئے نہیں کہ ان کو مہیا کرنے کا سامان
بھی وہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان کو ہوا پانی روشنی
وغیرہ کی ضرورت ہے تو یہ سب ضرورتیں لازمی طور پر اپنے ساتھ رکھتا
ہے جو اس سے الگ نہیں ہو سکتیں یہ اس بادشاہ کی طرح ہے
جو جہاں جاتا ہے اپنے خدام و توابع[۵۲] اور اپنی ضرورت کی ساری
چیزیں اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ بادشاہ کا جہاں خیمہ لگتا ہوتا ہے
وہاں بادشاہ کے ورود[۵۳] سے پہلے ہر چیز مہیا ہو جاتی ہے کیونکہ
ان چیزوں کو مہیا کرنے کی قدرت بادشاہ میں ہے۔ اسی طرح
انسان کی سواری عالم میں اترنے سے پہلے زمین، سورج
ہوا پانی غرض ہر چیز پہلے مہیا ہو چکی۔ سارا عالم ایک خیمہ
ہے جو اس بادشاہ کے لئے اس کے وارد ہونے سے پہلے
لگایا اور آراستہ کیا گیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ بادشاہ نے اپنی
سواری کے آگے اپنے خدام و توابع اور ضرورت کی ہر چیز کو بھیج
دیا۔ جب سارا عالم انسان کے اپنے اعضا اور اپنے اندر شامل
ہوا تو انسان کو تمام عالم کا مالک کہا جائے گا یا محتاج ؟

۵۱ دولت مند ۔ ۵۲ نوکر چاکر ۔ ۵۳ پہنچنے

حقیقت عالم انسان ہے

جب ہم خارجی دنیا کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد اس تصور سے ہوتی ہے جو مشاہدہ سے ہمارے اندر بنتا ہے۔ بننے سے مراد پیدا ہونا ہے نسبت سے ہست ہونا نہیں یعنی حس کا مادہ پہلے سے ہمارے اندر موجود تھا لیکن ہم اس سے بے خبر تھے اب خبردار ہو گئے پس ہر تصور کرنے والے کا تصور اس کی اپنی استعداد تصور پر منحصر ہے جب میں کہتا ہوں کہ یہ چیز سرخ ہے اور وہ سبز ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے اندر ان چیزوں کو دیکھنے سے دو الگ الگ تصور پیدا ہوتے ہیں۔ جن کو ایک دوسرے سے تمیز کرنے کے لئے ایک کا نام میں نے سرخ رکھا ہے اور دوسرے کا سبز۔ تو سرخ اور سبز کا مفہوم بھی میرا اپنا ہے۔ اور ان کا وجود بھی میری اپنی استعدادوں کا ظہور ایک مادر زاد اندھے کے لئے جو رنگوں کا تصور نہیں کر سکتا سرخ اور سبز کا کوئی وجود نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی دنیا اس کے اندر ہے۔ اور بیرونی دنیا اس کے اپنے اندرونہ کا عکس ہے۔ جیسے سینما کے پردہ پر جو تصویریں ظاہر ہوتی ہیں وہ فلم کے اندر کی نہایت چھوٹی چھوٹی تصویروں کے عکس ہیں جنہیں پردہ پر بڑا کر کے دکھایا گیا ہے۔ نفس انسانی ایک بہت بڑے بند صندوق کی طرح ہے جس میں سارا جہاں چھپا پڑا ہے لیکن انسان اس سے بےخبر ہے اس سے وقتاً فوقتاً کچھ ٹپک پڑتا ہے جوں جوں کوئی چیز ٹپکتی ہے اور ہمیں اس کے وجود کا علم ہوتا ہے

اسے ہم ایک نام دے کر اپنی معلومات کی فہرست میں درج کرتے جاتے ہیں۔ جو چیزیں ابھی نہیں ٹپکیں، اور ہماری فہرست میں نہیں آئیں ان کا ہمیں کچھ علم ہے نہ ہم ان کا کوئی ذکر کرتے ہیں۔ انسان جو کچھ کہتا کرتا دیکھتا اور سمجھتا ہے غرض جو کچھ اس سے ظاہر ہوتا ہے وہی ہے جو ظاہر ہونے سے پہلے اس میں مخفی تھا۔ شعور میں آنے سے پہلے تحت الشعور[1] میں تھا جو شعور میں آگیا اور اس کے وجود کا ہمیں علم ہوگیا اسے ہم 'موجود' کہتے ہیں جس کے وجود کا ہمیں علم نہیں ہوا اسے معدوم کہتے ہیں۔ تو ہر شخص کی موجودات اس کی اپنی معلومات ہیں۔ ادراک اشیاء کے معنی ہیں چیزوں کا پالینا۔ وہ چیزیں جن کا انسان ادراک کرتا ہے تحت الشعور میں پہلے سے ہوتی ہیں۔ پر ابھی انسان نے انہیں پایا نہیں ہوتا یعنی اس کے شعور میں نہیں آئی ہوتیں۔ جب تحت الشعور سے شعور میں آجاتی ہیں تو اس وقت کہا جاتا ہے کہ انسان نے ان کا ادراک کرلیا ہے یا انہیں پالیا ہے بس تمام موجودات کا وجود ذہنی ہے۔ جب میں کہتا ہوں کہ یہ چیز ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے علم میں ہے اور جب کہتا ہوں کہ یہ چیز نہیں تو مراد یہ ہوتی ہے کہ میرے علم میں نہیں۔

سوال ہوگا کہ اگر مادر زاد اندھا سرخ و سبز کو نہیں

---

[1] نیست ؛ کے Sub-Conscious Mind

جاننا تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ سرخ سبز کا واقع ہیں کوئی وجود نہیں سو جاننا چاہیئے کہ سرخ و سبز کا وجود واقع ہیں اس لئے ہے کہ مادر زاد اندھے کے سوا دوسرے انسانوں کے علم میں سرخ و سبز کا وجود ہے اگر تمام انسان مادر زاد اندھے کی طرح سرخ و سبز کے تصور سے محروم ہوتے تو بے شک نہ سرخ و سبز کا وجود ہوتا نہ ذکر اور نہ یہ الفاظ ہوتے ۔ ہر چیز جس کو انسان موجود کہتا ہے کسی نہ کسی انسان کے علم میں موجود ہوتی ہے ۔ جو کسی بھی انسان کے علم میں نہیں وہ انسانی دنیا کے لئے نہ موجود ہے نہ اس کا ذکر ہے ۔ فرد کی دنیا اس کی اپنی معلومات ہیں اور نوع کی دنیا نوع کی مجموعی معلومات کا قدر مشترک "واقع ہیں" کا مطلب ہے "نوع انسان کے مجموعی علم میں" ۔ باقی رہی غیر انسانی دنیا تو کون کہہ سکتا ہے کہ گلاب کا پھول سرخی، خوبصورتی، نرمی اور خوشبو کا جو تصور انسان میں پیدا کرتا ہے وہی تصور گدھے میں پیدا کرتا ہے خود گدھا ایک نام ہے جو انسان نے اس تصور کے لئے تجویز کیا ہے جو گدھے کے مشاہدہ سے انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے ۔ اور گدھے کے انسانی تصور میں یہ شامل نہیں کہ وہ گلاب کے پھول سے اسی طرح لطف اندوز ہوتا ہے جس طرح انسان اور اس میں وہی نظام پاتا ہے جو انسان پاتا ہے ۔ انسان کی تمام بحثیں انسانی تصورات سے ہیں پس گدھے کی دنیا جو کچھ بھی ہوگی اس دنیا سے مختلف ہوگی جسے انسان دنیا کہتا اور سمجھتا ہے ۔

اگر دنیا انسان کے اندر ہے اور جو کچھ وہ مشاہدہ کرتا ہے اپنے

اندر کی چیزوں کا مشاہدہ ہے نہ کہ باہر کا تو پھر اس کا کیا سبب ہے کہ جب تک مثلاً وہ باغ میں نہیں جاتا گلاب کے پھول کا مشاہدہ نہیں کر سکتا؟ اگر پھول اس کے اندر تھا تو چاہیئے تھا کہ اس کے مشاہدہ کے لئے اسے گلستان میں جانے کی حاجت نہ ہوتی۔ سو واضح ہو کہ باغ اور پھول وغیرہ آئینے ہیں جو ہمیں ہمارے اندر کا باغ اور پھول دکھاتے ہیں۔ اپنا چہرہ جو ہم آئینہ میں دیکھتے ہیں واقع میں وہ ہمارے پاس ہوتا ہے لیکن جب تک آئینہ سامنے نہ ہو ہم اپنا چہرہ نہیں دیکھ سکتے اسی طرح پھول جو ہم باغ میں دیکھتے ہیں ہوتا تو ہمارے اندر ہے لیکن جب تک باغ اور پھول کو دکھانے والا آئینہ نہ ہو ہمارے اندر کا باغ اور پھول ہمیں نظر نہیں آتا۔ اس موقعہ پر شاید آپ کے دل میں یہ خیال اُٹھے کہ کم از کم خارج میں آئینوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ سو واضح رہے کہ آئینہ جس میں ہم اپنا چہرہ دیکھتے ہیں وہ بھی ہماری اپنی ایجاد ہے باغ پھول وغیرہ دکھانے والے آئینے بھی ہمارے اندرونی حقائق کے ظہورات اور ہمارے اپنے اعضا اور اجزاء ہیں۔ سارا جہان انسان میں شامل ہے۔ واضح رہے کہ میں وجود عالم کا انکار نہیں کرتا میرا مطلب یہ ہے کہ انسان چھوٹے پیمانہ پر کل عالم ہے حقیقت عالم انسان ہے اور جسے ہم خارجی عالم کہتے ہیں وہ اس حقیقت کا ظہور۔ غرض عالم جو انسان کے علم میں ہے انسان اور اس کے موجودہ قواء کے دم سے

ہے۔ انسان نہ ہو تو وہ چیز جسے انسان عالم کہتا ہے نہ ہو پس حقیقت عالم انسان ہے۔

وجود وحدت سے ہے

مادہ کا ابتدائی ذرّہ جسے ایٹم کہتے ہیں الکٹرونز اور پروٹونز کا ایک نظام ہے۔ ایٹم کو جو چیز ایٹم بنائے ہوئے ہے وہ اس کے اعضاء کا ایک نظام میں منظم ہونا ہے۔ اگر یہ نظام نہ ہو یہ ایکا نہ ہو۔ تو ایٹم کا کوئی وجود نہیں۔ ایٹم اپنے اعضاء کے ایکے کا نام ہے لیکن اس ایکے کو اپنے وجود کا احساس نہیں اس ایکے میں اگر ایسی ترقی ہو جائے کہ وہ محسوس کرنے لگے کہ میں ہوں تو اس وقت اسے زندہ نظام کہیں گے بیجان مادہ میں زندگی مخفی ہونے کے یہی معنیٰ ہیں کہ بے جان مادہ کو اپنی وحدت کا احساس نہ تھا۔ احساس وحدت کا ابتدائی ظہور نبات میں ہوا۔ اور انواع نباتات اور حیوانات میں اس نے ترقی کی زندگی کی ترقی سے احساس وحدت کی ترقی ہی مراد ہے۔ انسان میں یہ احساس طبعی زندگی کی حد سے گذر کر ایک اور شان میں جلوہ گر ہوا جس کا نام انسانیت ہے۔ تمام موجودات وحدت کے دم سے موجود ہیں۔ بے جان مادہ وحدت مخفیہ ہے۔ نباتات اس کے ابتدائی ظہور سے حیوانات اس کے ظہور کی ترقی سے اور انسان اس کے کمال سے۔ کمال کا لفظ اضافی ہے۔

وحدت انسانی۔ زندگی احساس وحدت کا نام ہے۔ اور

احساس وحدت کی ترقی کے ساتھ زندگی ترقی کرتی گئی ہے یعنی زندگی کی صلاحیت جذبہ اور نوعیت سب بدلتی گئی ہیں۔ کہنے کو حیوان بھی زندہ ہے اور انسان بھی زندہ لیکن ان دونوں زندگیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انسانی زندگی کا سرچشمہ انسانیت ہے اور حیوانی زندگی کا سرچشمہ حیوانیت اور انسانیت یقیناً حیوانیت سے اوپر کی چیز ہے حیات طبعی دونوں میں مشترک ہے لیکن یہ حیات حیوان کا سر ہے اور انسان کا پاؤں حیوان جہاں ختم ہوتا ہے انسان وہاں سے شروع ہوتا ہے اور یوں دونوں حیات طبعی کے نقطہ پر ملتے ہیں۔

حیوان انفرادی طور پر یا زیادہ سے زیادہ معدود گروہوں میں ہوکر اپنی اپنی طبعی حیات کے لئے جو کوشش ان سے ہوسکتی ہے کرتے ہیں جس کا کوئی قابل ذکر نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے انسان اجتماعی حیات کے لئے اجتماعی کوشش کرتا ہے۔ انسان کی یہ اجتماعی کوشش صرف کسی ایک مخصوص زمانہ یا وطن تک محدود نہیں۔ انسان نہ صرف اپنے زمانہ کے بلکہ ماضی کے نہ صرف نزدیک کے بلکہ دور کے سارے انسانوں کو اپنی کوشش میں شامل کرلیتا ہے اور ان کے تجربات اور معلومات سے فایدہ اٹھاتا ہے۔ پھر اپنی کوششوں کو آیندہ نسل کی امداد کے لئے چھوڑ جاتا ہے۔ گویا ازل سے ابد تک اور مشرق سے مغرب تک انسان اجتماعی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اور اس کی ساری ترقیات کا راز اسی اجتماعی کوشش میں ہے۔ ہر فرد انسان محسوس کرتا ہے

کہ وہ اپنے آپ میں انسانی مانگوں کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں۔ ہر فرد میں کچھ کمی ہے جو دوسرے افراد پورا کرتے ہیں گویا سب افراد مل کر ایک پورا انسان بنتے ہیں۔ چونکہ ہر فرد دوسروں کی امداد کا محتاج ہے دوسروں کی بقا اس کی اپنی بقاء ہے اور ان کی فنا اس کی اپنی فناء۔ انسان فرد کا نام نہیں بلکہ اس حقیقت واحدہ کا نام ہے جس کے پائے جانے سے فرد انسان کہلاتا ہے اور جو تقسیم پذیر نہیں جس طرح ایک زندہ جسم کا کوئی عضو دوسرے اعضاء سے الگ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا ٹھیک اسی طرح نوع انسان کا کوئی فرد دوسرے افراد سے الگ ہو کر انسان نہیں رہ سکتا علیحدگی کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت جو تقسیم قبول نہیں کرتی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور وہ انسانیت سے عاری ہو جاتا ہے۔ گو وہ ظاہری صورت سے دھوکا کھا کر اپنے آپ کو انسان کہتا ہے۔ انسان اسی وقت تک انسان ہے جب تک وہ اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے الگ نہ سمجھے۔ اپنے آپ اور دوسرے میں فرق نہ کرے۔ اس کی تحقیر کو اپنی تحقیر اور اس کی حق تلفی کو اپنی حق تلفی یاد کرے جو بھی کہ اس نے اپنے کو دوسرے سے الگ سمجھا اپنے آپ کو اس پر ترجیح دی اور اس کے انسانی حقوق کا انکار کیا وہ خود انسانیت سے گر گیا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ افراد میں جو استعدادوں اور طبائع

کا اختلاف اس سے وحدت انسانی کا دعوے باطل[1] ہو جاتا ہے
سو واضح رہے کہ یہ ایک دھوکا ہے ۔ افراد میں اختلاف طبائع
ایسا ہی ہے جیسے اعضاء انسانی کے افعال کا اختلاف ۔ سر سے
لے کر پاؤں کے ناخنوں تک بال بال میں دورانِ خون جس کی
بدولت ہر عضو زندہ ہے دل کا فعل[2] ہے اگر دل اپنا فعل ایک
سکینڈ کے لئے بند کر دے تو آناً فاناً موت واقع ہو جاتی ہے بخلاف
اس کے پاؤں اگر جسم کے اٹھائے پھرنے کی خدمت پندرہ روز کے
لئے بھی چھوڑ دے تو زندگی باقی رہ سکتی ہے اگر دل یہ دعوے
کرے کہ چونکہ زندگی میرے دم سے قایم ہے مجھے باقی اعضاء پر
فوقیت ہے تو یہ دعوے صحیح نہیں ۔ دل کو یہ نہ بھولنا چاہیئے
کہ اگر زندگی اس کے دم سے قایم ہے تو وہ خود جسم کے ذرّہ ذرّہ
کے دم سے قایم ہے ۔ دل کو اپنی جس خدمت پر ناز ہے وہ تنہا
گوشت کے اس ٹکڑے کا فعل نہیں جسے دل کہتے ہیں بلکہ دل کو
یہ خدمت انجام دینے کے قابل بنانے میں جسم کے ذرہ ذرہ کا دخل
ہے ۔ ہاتھ روزی کماتا ہے ، دانت غذا چباتے ہیں ، معدہ ہضم
کرتا ہے ۔ جگر خون تیار کرتا ہے ۔ تب جاکر دل اس قابل ہوتا ہے کہ
خون جسم کے ہر رگ و ریشہ میں پہنچائے ۔ پس اگرچہ کہنے کو دل یہ
اہم خدمت انجام دے رہا ہے ۔ اصل میں دل کا یہ فعل سارے اعضاء
کی محنت کا ثمرہ ہے ۔ اور اس طرح دیکھنے میں گو دل جسم کے ایک جزو

---

[1] جھوٹا ۔ [2] کام ۔

کا نامہ ہے۔ فی الحقیقت اس جزو میں کل پنہاں ہے۔ یہی حال باقی تمام اعضا کا ہے۔ نظام جسم میں باقی پرزوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی بدولت ہر پرزہ جو کام کر رہا ہے وہ اس ایک پرزے کا کام نہیں بلکہ پوری کل کا کام ہے۔ اور اس طرح ہر جزو میں کل کا ظہور ہے۔ پس کسی پرزہ کو حق حاصل نہیں کہ اپنی کسی لیاقت یا حسن کارکردگی پر نازاں ہو کر دوسرے پرزہ کی تحقیر کرے کیونکہ اس کی لیاقت یا حسن کارکردگی تمام کل کی ہے نہ کہ کسی ایک پرزہ کی لیاقت یا کارکردگی۔

افراد میں استعدادوں کا اختلاف بیشک موجود ہے۔ بعض کو بہت اعلےٰ دل و دماغ عطا ہوئے ہیں بعض کو کم تر درجہ کے۔ کوئی جسمانی طاقت کے لحاظ سے آگے ہے کوئی پیچھے۔ کسی کو مال کمانے کی اہلیت کا وافر حصہ ملا ہے کسی کو کم۔ ایک انجنیئر ہے جو دریا کے پل کا نقشہ تجویز کرتا ہے جو بہت مشکل کام ہے اور دوسروں سے نہیں ہو سکتا اگر یہ انجنیئر نقشہ تیار نہ کرتا تو رفاہ عامہ کا بہت بڑا کام نہ ہو سکتا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر انجنیئر نہ ہوتا تو پل کا نقشہ تجویز نہ ہو سکتا۔ لیکن اول تو انجنیئر کے انجنیئر بننے میں دوسرے افراد کا جو انجنیئر نہیں ہیں بہت بڑا دخل ہے۔ اگر وہ دوسرے افراد اس کی ضروریات کے کفیل نہ ہوکر اس کو انجنیئری سیکھنے کے لئے فارغ نہ کر دیتے تو وہ انجنیئر نہ بنا ہوتا مثلاً اگر اس کو خود ہی اپنے لئے کسان کا، جولاہے کا، درزی کا غرض ہر ضرورت کا کام کرنا ہوتا تو اسے انجینیری کے لئے وقت نہ ملتا۔ انجنیری کا فن کسی ایک فرد کا ذاتی کارنامہ

نہیں بلکہ افراد نوع کی مسلسل[1] کوششوں اور محنتوں کا نتیجہ ہے جو وہ لمبے عرصہ سے کرتے آئے ہیں۔ دوسرے اگر پل کی تعمیر میں کام کرنیوالے کاریگر اور مزدور نہ ہوتے تو پل کا نقشہ تجویز ہو کر بھی دھرا دھرا رہ جاتا اور پل نہ بن سکتا۔ ایک سرمایہ دار ہے جس کے کارخانہ میں مزدور کو اپنی روزی کے لئے کام کی حاجت ہے لیکن سرمایہ خود بخود مزید سرمایہ پیدا نہیں کر سکتا سرمایہ دار کو بھی مزدور کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی مزدور کو سرمایہ دار کی۔ کسان کو بے شک جلاہے کی، درزی کی، جوتا سینے والے کی حاجت ہے لیکن ان سب کو غلہ حاصل کرنے کے لئے کسان کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کسان کو ان کی۔ رئیس بلدیہ بے شک ایک قیمتی وجود ہے لیکن محلہ کا بھنگی اس سے کچھ کم ضروری نہیں۔ رئیس کی مہینہ بھر کی غیر حاضری کے باوجود گذر اوقات ہو سکتی ہے لیکن بھنگی تین روز ہڑتال کر دیں تو زندگی محال ہو جاتی ہے۔ غرض جیسے کہ میں نے عرض کیا ہر فرد دوسرے افراد کا محتاج ہے اور ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر وہ خدمت انجام دے رہا ہے جو دوسرا نہیں دے سکتا۔ یاد رہے کہ استعدادوں کا یہ اختلاف اس لئے ہے کہ فطرت انسانی کے بے شمار تقاضوں[2] میں سے کسی کو کوئی پورا کر دے اور کسی کو کوئی اور اس طرح سب مل کر سب تقاضوں کو پورا کر دیں۔ ایک میں جو کمی ہے وہ دوسرا مہیا کر دے اور دوسرے میں جو کمی ہے وہ پہلا پوری کر دے ہر فرد ایک فن میں دوسرے کا محتاج ہو اور دوسرے فن میں اس کا حاجت روا اور یہ باہمی احتیاج[3] و حاجت روائی[4] ان کے باہمی اتحاد کا موجب ہو۔ اختلاف

[1] لگاتار ۔ [2] مانگوں ۔ [3] آپس کی ضرورت ۔ [4] ضرورت کو پورا کرنا ۔

طبائع نہ ہوتا تو باہمی احتیاج و حاجت روائی نہ ہوتی اور اگر یہ نہ ہوتی تو ضرورت اتحاد مفقود[1] ہوتی۔ پس اختلاف طبائع موجب اتحاد ہے نہ کہ موجب فساد۔

۳۔ ترقی و تنزل

ترقی و تنزل دونوں حرکت کے نام ہیں سکون میں ترقی ہے نہ تنزل۔ ترقی اور تنزل کی شناخت یہ ہے کہ ترقی سے سکھ پیدا ہوتا ہے اور تنزل سے دکھ اور اگر دکھ سکھ نہ ہو تو یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ ہو کہ راہرو[2] ترقی کر رہا ہے یا تنزل۔ سکھ حوصلہ افزائی یا انعام ہے کہ قدم ٹھیک راہ پر ہے اٹھائے چلے جاؤ۔ دکھ تنبیہہ اور چابک ہے کہ دیکھو راہ سے بھٹک گئے ہو لوٹ کر راہ پر چلے جاؤ ورنہ مار کھاؤ گے انسان کو صحیح راہ پر رکھنے کے لئے کتنا بڑا اہتمام ہے سکھ راستے پر کھڑا ہے یہ بتانے کو راستہ یہ ہے۔ راستے سے ادھر ادھر چاروں طرف میں دکھ پھیلا ہوا ہے بھولے ہوئے کو مجبور کر کے راہ پر لانے کو۔ جب تک انسان کو دکھ نہیں پہنچتا اس کو سکھ کی قدر معلوم نہیں ہوتی۔ دکھ سکھ کی قدر معلوم کرانے کو ہے تاکہ انسان سکھ کی راہ اختیار کئے رہے اور اگر بھٹک جائے تو پھر راہ پر آجائے۔

اگر سکھ کی پکار یہ ہے کہ میری طرف آؤ تو دکھ کی پکار بھی یہی ہے کہ مجھ سے لوٹ کر سکھ کی طرف جاؤ پس دکھ بھی سکھ پہنچانے کے لئے

[1] پائی نہ جاتی۔ [2] راہ چلنے والا۔

ہے اور تنزل بھی ترقی کے لئے ۔ کہتے ہیں انسان گر گر کر سوار ہوتا ہے ۔ اچھی طرح سے سمجھ لینا چاہیئے کہ گرنا گراوٹ سے نکلنے کے لئے ہے یعنی اپنے اندر ایسی طاقت پیدا کرنے کے لئے کہ آئندہ گرنے نہ پائے ۔ اگر گرنے کے تجربہ سے انسان یہ معلوم کرلے کہ کن کمزوریوں سے اور کن باتوں کا خیال نہ رکھنے سے یا کن موقعوں سے ہوشیار نہ رہنے سے وہ گرا ہے اور آئندہ کے لئے ان کمزوریوں اور غفلتوں کا علاج کر لے اور ان موقعوں سے اپنا بچاؤ کرلے اور اس طرح گراوٹ پر قابو پالے تو ایسا گرنا نہ گرنے سے زیادہ بابرکت ہے کیونکہ جو گر کر اٹھ نہیں چکا اس نے ابھی گراوٹ کو فتح نہیں کیا اور یہ اسے فتح کر چکا ہے لیکن جو ہر روز گرتا ہے اور گرنے کی حکمت سے آگاہ نہیں ہوتا اور گرنے سے جو سبق سیکھنا مقصود تھا نہیں سیکھتا وہ ہمیشہ نیچے سے نیچے گرتا جائے گا یہاں تک کہ اس میں گراوٹ سے نکلنے کی حس[1] بیدار ہو ۔

انسان جب سے زمین پر آیا ہے اپنے لئے سکھ کی تلاش میں ہے انفرادی، جماعتی، مذہبی، سیاسی تمام کوششوں کا نصب العین[2] یہی ہے ۔ انسان نے بارہا کہا اور سنا ہے کہ سکھ دو گے تو سکھ پاؤ گے دکھ دو گے تو دکھ پاؤ گے ۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے ۔ لیکن اس نے ابھی تک یہ سبق نہیں سیکھا ۔ جیسے تمام انسانوں کی انسانیت ایک ہے ویسے ہی تمام انسانوں کا دکھ سکھ ایک ہے نہ کوئی فرد دوسرے افراد سے الگ ہو کر زندہ رہ سکتا ہے نہ دوسروں سے

[1] خیال پیدا ہو ۔ [2] منزل مقصود جہاں انسان پہنچنا چاہتا ہے ۔

الگ ہو کر سکھ پا سکتا ہے۔ اگر ہر فرد اپنے سکھ کے لئے کوشش کرے گا اور اس کوشش میں دوسروں کے سکھ کو ملحوظ نہ رکھے گا تو اس کی کوشش دوسروں کے مفاد کے خلاف ہو گی اور وہ اپنے اپنے مفاد کے لئے اس کے خلاف کوشش کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے سکھ کے لئے اس کی اکیلی کوشش کے مقابلہ میں دوسرے افراد کی کئی کوششیں کام کر رہی ہوں گی۔ اس حالت میں ظاہر ہے کہ اس کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی یہی حال ہر فرد کی انفرادی اور ہر جماعت کی جماعتی کوشش کا ہے۔ بخلاف اس کے اگر میں سب کے سکھ کے لئے کوشش کروں تو چونکہ میری کوشش سے نقصان کسی کو نہیں اور فائدہ سب کو ہے تمام لوگ میری کوشش میں شریک ہو جائینگے کوشش کامیاب ہو جائے گی اور سب کو سکھ حاصل ہو جائے گا۔ دیکھئے سرمایہ داروں نے صرف اپنے مفاد کو مدِّنظر[له] رکھا اور مزدور کے مفاد سے بے پروائی اختیار کی مزدور نے جب دیکھا کہ سرمایہ دار کی خودغرضی سے اس کی زندگی تلخ ہو گئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے نہ صرف سرمایہ دار کو دکھیا ہی کر دیا بلکہ اس کے خاتمہ کی ٹھان لی آخر کار یہ سودا خود سرمایہ دار کو مہنگا پڑا اور نہ صرف سرمایہ سے بلکہ جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ یہ عالمگیر جنگیں جنہوں نے کئی سال کرۂ ارض کو جہنم بنائے رکھا ہے یہ بھی مختلف وطنوں اور قوموں کی اپنے اپنے مفاد کے لئے الگ الگ کوششوں کا انجام ہیں۔ اور جب تک افراد جماعتیں اور قومیں وحدت انسانی کے راز کو نہیں پالیتیں

له سامنے :

اس جہنم سے نہیں نکل سکتیں ۔

اگر جسم کے اجزاء کو ایک دوسرے سے الگ کیا جائے تو سارے جسم کو درد ہوتا بلکہ زندگی کا ختم ہوجانا ضروری ہے افراد انسانی جسد انسانیت کے اعضاء ہیں ان کی زندگی اور خوش حالی ایک ہوکر رہنے میں ہے۔ باہمی جنگ و جدل فطرت انسانی کے خلاف ہے جسے وہ برداشت نہیں کرسکتی دکھ فطرت کی چیخ و پکار ہے کہ کسی فرد یا جماعت کا اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دینا غلط راہ ہے۔ نظریہ جہد للبقا کی بنیاد اس بات پر ہے کہ باہمی جنگ فطرت میں داخل ہے بخلاف اسکے میری رائے یہ ہے کہ باہمی جنگ فطرت کے خلاف ہے جبھی تو اس سے ساری نسل انسانی دکھیا ہوگئی ہے۔ فطرت کے خلاف یا موافق ہونے کی پرکھ یہ ہے کہ جو چیز موافق فطرت ہے اس سے سکھ پہنچیگا اور جو مخالف فطرت ہے اس سے دکھ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مشین میں جس طرح چلنے کی صلاحیت ہے اگر اس کے موافق اس کو چلایا جائے تو بلا روک وہ آسانی سے چلتی ہے اور اگر اس کی صلاحیت کے خلاف اس پر زور ڈالا جائے تو بگڑ جاتی ہے یا ٹوٹ جاتی ہے۔ سو کچھ شک نہیں کہ انسانی افراد یا جماعتوں کا اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دینا اور اس ترجیح کی بنا پر دوسروں کے انسانی حقوق کا انکار کرنا جس سے پیکار باہمی پیدا ہوتی ہے ۔ سراسر فطرت کے خلاف ہے ۔

زمین پر جو کئی انواع حیوان پیدا ہوئیں اور دوسری انواع نے انہیں فنا کردیا ۔ عالم کی مجموعی حیات میں ان کی فنا اس طرح پر ہے جیسے پھول میں جب پھل تیار ہوجاتا ہے پھول کی پتیاں جھڑ جاتی ہیں ۔ پھول کی پتیوں کی باقی درخت سے الگ کوئی زندگی نہ تھی ۔ زندگی سارے درخت کی مشترکہ تھی اور سارے درخت

کا مقصد پھل کی تیاری اور پرورش تھا اور جب پھل تیار ہوگیا پھول کی پتیوں کا مقصد پورا ہوگیا۔ شجرِ عالم کے ذرہ ذرہ کا مقصد انسان تھا اور ہے۔
جس جس نوع کی جس جس وقت ارتقاء مطلوب کے زینوں کے طے پر ضرورت لاحق ہوئی وہ وجود میں آتی گئی اور جوں جوں اپنا کام ختم کرتی گئی رخصت ہوتی گئی۔ رخصت ہونا ظاہر کے لحاظ سے ہے ورنہ فی الحقیقت اگلی نوع میں تبدیل ہوتی رہی کیونکہ سلسلہ ارتقاء میں ہر آئندہ قدم تمام پچھلے قدموں کو اپنے اندر شامل رکھتا ہے چونکہ فنا شدہ اور باقیماندہ تمام کی تمام انواع عالم کے نظامِ واحد کے اجزاء تھیں اور ہیں اور کسی کی دوسرے اعضاء سے الگ کوئی زندگی نہیں جہد للبقاء کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔
فطرت میں وحدت ہے اور باہمی جنگ و جدال فطرت سے گراوٹ ہے اور پہلے دکھایا جا چکا ہے کہ گراوٹ اس لئے نہیں کہ انسان اس میں پڑا رہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس سے نکلے۔ ان دو عالمگیر جنگوں نے جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئیں نظریہ جہد للبقاء کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ اور انسان جنگ سے تنگ آ کر اب متحد ہونا چاہتا ہے چنانچہ ہر روز اتحادِ عالم کی تحریکیں اور منشور ہے ہو رہے ہیں۔ نہ معلوم ابھی کتنی دیر اور دنیا کو بغض و عداوت کے جہنم میں جو فطرت کی خلاف ورزی کے باعث بھڑکی ہے رہنا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر انسان نے کرہ ارض پر باقی رہنا ہے تو اب مختلف قوموں، وطنوں اور جماعتوں میں محصور نہ ہونا چاہیئے۔ انہیں فطرت کی پکار کو سننا چاہیئے اور متحد ہو جانا چاہیئے ورنہ ان کی خیر نہیں۔
میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ دکھ راہ راست پر لانے کے لئے ایک

چابک ہے سو یہ جنگیں انسان کو وحدت انسانی کی راہ پر لانے کے لئے چابک کا کام دیتی ہیں اور سابقہ زمانوں میں انواع حیوانی میں جو پیکار رہی ہے اس کی غرض بھی ارتقاء کی رفتار کو تیز کرنا تھا۔

پس پیکار جو عالم میں رہی ہے اور اسوقت ہے تعدد حیات اور جہد للبقاء کے باعث نہیں بلکہ عالم کو شاہراہ ترقی پر لانے کیلئے ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ جونہی کہ کوئی دکھ لاحق ہو سمجھ جائے کہ اس سے فطرت کی خلاف ورزی سرزد ہوگئی ہے اور سبق جو دکھ دینا چاہتا ہے فوراً لے لے اور دکھ سے نجات حاصل کرلے۔

مذکورہ بیان سے ظاہر ہے کہ ترقی اس حرکت کا نام ہے جو وحدت کی سمت میں ہو یعنی وحدت کو اپنا نصب العین ٹھیرا کر جو قدم اٹھایا جائیگا وہ ترقی کہلائے گا اور جو قدم شاہراہِ وحدت سے ہٹا ہوا ہوگا وہ تنزل۔

۴۔ سچ اور جھوٹ

جو کچھ میں دیکھتا ہوں سنتا ہوں، یا سمجھتا ہوں، یعنی جو کچھ میں محسوس کرتا ہوں۔ اگر میں اسے ٹھیک واقعہ کے مطابق بیان کروں۔ تو میں سچ کہتا ہوں۔ اور اگر اپنے محسوسات و مدرکات کے برخلاف کوئی بات کہوں تو وہ جھوٹ ہے۔ آنکھوں والا جو سرخ و سبز میں تمیز کر رہا ہے اگر کہے کہ ان میں فرق نہیں تو وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ غرض ہر شخص کا جھوٹ سچ اس کے اپنے احساسات مدرکات۔ اور تجربات پر منحصر ہے۔ جو چیز مجھے

کڑوی سی محسوس ہوتی ہے۔ وہ میرے نزدیک کڑوی ہے۔ جو مجھے میٹھی لگتی ہے۔ وہ میرے نزدیک میٹھی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو چیزیں دوسرے سب لوگوں کو میٹھی لگتی ہیں وہ مجھے کڑوی محسوس ہوتی ہیں۔ اس صورت میں غلط اور صحیح کا معیار کثرت رائے ہوگا جو چیزیں تمام دوسرے لوگوں کو میٹھی محسوس ہوتی ہیں۔ اگر وہ مجھے کڑوی لگتی ہیں تو یہ مانا جائے گا کہ میرا ذائقہ بگڑا ہوا ہے۔ اور اس کی شہادت قابلِ اعتبار نہیں۔ جس طرف کثرت رائے ہے وہ صحیح ہے لیکن یاد رہے کہ کثرت سے مراد ایسے لوگوں کی کثرت ہے جن کا ذائقہ درست ہے۔ فرض کرو کہ ایک خاص مقام پر دس شخص تپ صفراوی کے مریض ہیں اور سب کا ذائقہ بگڑا ہوا ہے وہ سب کہتے ہیں کہ پانی کڑوا ہے۔ وہاں صرف ایک تیمار دار ہے جو تندرست ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پانی کڑوا نہیں۔ اگر یہ مریض اپنی کثرت رائے پر یہ فیصلہ کردیں کہ فی الواقع پانی کڑوا ہے تو یہ فیصلہ صحیح نہ ہوگا اسی طرح فرض کرو کہ ایک ماہر طب جس نے سالہا سال کی تحقیقات و محنت کے بعد طب میں کمال حاصل کیا ہے۔ گنواروں کے گاؤں میں جا پھنستا ہے۔ وہاں طب سے ناواقف محض لوگوں کی بے پناہ کثرت تشخیص مرض میں اس طبیب سے اختلاف کرے تو ان سب کے مقابلہ میں ماہر طب کی اکیلی رائے وزنی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کثرت ان لوگوں کی ہونی چاہیئے جو اس فن میں مہارت رکھتے اور صحیح رائے دینے کے قابل ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ رائے سے مراد یہاں وہ شہادت ہے جو ذاتی تجربہ کے بناء پر پوری دیانتداری اور ذمہ داری سے دی گئی

ہو۔ نہ کہ محض تقلید پر جس کا کبھی تجربہ نہیں کیا گیا۔ پرانے زمانے میں یونان جیسے عقلمند ملک میں نہ صرف عوام بلکہ علماء تک مانتے آتے تھے کہ اگر پانی کے بھرے ہوئے برتن میں مچھلی ڈال دی جائے تو نہ پانی برتن سے گریگا نہ وزن بڑھیگا۔ ایک روز ایک معمولی آدمی نے تجربہ کیا تو معلوم ہوا کہ یونانیوں کا مسلمہ جیسے تجربہ کی کسوٹی پر کبھی پرکھا نہیں گیا تھا غلط محض تھا۔ پانی کے بھرے ہوئے برتن میں مچھلی ڈالی جائے تو پانی گرتا بھی ہے اور وزن بھی بڑھ جاتا ہے۔ الغرض ایسے لوگوں کی کثرت رائے جو اہل الرائے ہیں اور انکی رائے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے معیار صداقت ہوگی۔ پس کثرت میں جو وحدت ہے اس کا نام سچائی ہے

۵ نیکی اور بدی

نیکی وہ ہے جس سے سکھ پہنچے۔ اور بدی وہ ہے جس سے دکھ پہنچے سکھ ہر انسان کی فطری مانگ ہے۔ اگر ایک قول یا فعل سے مجھے سکھ پہنچتا ہے لیکن میرے ہمسایہ کو دکھ پہنچتا ہے۔ اگر میری قوم کو سکھ پہنچتا ہے لیکن دوسری قوم کو دکھ پہنچتا ہے غرض انسانوں کے ایک حصہ کو سکھ پہنچتا ہے اور دوسرے کو دُکھ تو وہ نیکی نہیں بدی ہے۔ ہاں ایک خونی کو پھانسی کی سزا دینے میں بیشک اسے دُکھ پہنچتا ہے لیکن اگر خونی کو سزا نہ دی جائے تو تمام انسانوں کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے اور سب دکھیا ہو جائیں۔ اس واسطے وہ قول اور فعل جس سے نسل انسانی کی بڑی سے بڑی

تعداد کو سکھ پہنچے نیکی ہے۔ اگر کثرت کو دکھ سے بچانے کے لئے چند کو دکھ میں ڈالنا ضروری ہو جائے یعنی ان کو دکھ دیئے بغیر کثرت کو دکھ سے بچانے کا کوئی راستہ نہ ہو تو چند کو صرف اتنا دکھ دینا جس سے کثرت دکھ سے محفوظ ہو جائے بدی نہیں نیکی ہے۔ کیونکہ یہ نیکی کی تعریف میں جو اوپر مذکور ہوئی شامل ہے۔ اسی طرح ایک بیمار پر عمل جراحی کرنے میں اگرچہ اُسے دکھ ہے اس عارضی دکھ کی غرض اسے بیماری کے ہمیشہ کے دکھ سے نجات دلانا ہے۔ اس لئے یہ ظاہری دکھ جو باطن میں سکھ ہے نیکی میں شامل ہے۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ سکھ ترقی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور ترقی وحدت کی سمت میں حرکت کا نام ہے۔ نیز نیکی اس قول و فعل کو قرار دیا گیا ہے جس سے نسل انسانی کی بڑی سے بڑی تعداد کو سکھ پہنچے۔ اس لئے نیکی وہ عمل ہے جو وحدت کو مدِ نظر رکھ کر کیا جائے اور بدی وہ جس میں کثرت سے دھوکا کھا کر وحدت کو نظر انداز کر دیا جائے۔

۶۔ خدا اور رسول

صہ لغایت ۱۷ میں دکھایا گیا ہے کہ انسان کو عالم میں جا بجا ارادہ اور تدبیر کام کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن ہر چند انسان نے کوشش کی ہے کہ صاحب ارادہ اور مدبّر کا کھوج نکالے اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ناکامی کا باعث یہ ہے کہ خدا واحد لاشریک ہے یعنی ایسا ایک جس کے ساتھ دوسرا کوئی نہیں۔ انسان ہر چیز کا تصور اس کی ضد

کی نفی سے کرتا ہے۔ مثلاً روشنی کا تصور وہ یوں کرتا ہے کہ پہلے "تاریکی کا جو روشنی کی ضد ہے تصور کرتا ہے پھر اس تصور کی نفی یعنی "تاریکی نہ ہونے کا نام روشنی رکھتا ہے۔ اگر ہمیشہ دن ہی ہوا کرتا۔ رات کبھی نہ ہوتی۔ تو انسانی زبان میں نہ صرف رات کا لفظ نہ ہوتا بلکہ دن کا لفظ بھی نہ ہوتا اسی طرح انسان ایک کا تصور کرنے سے پہلے ایک کی ضد کا جو دو تین وغیرہ ہیں۔ تصور کرتا ہے۔ پھر اس تصور کی نفی کا نام ایک رکھتا ہے جیسے رات نہ ہوتی تو انسان خالص دن کے تصور سے عاجز ہوتا اسی طرح خالص ایک کے تصور سے جس کے مقابل پر دو تین وغیرہ اعداد نہ ہوں انسان عاجز ہے۔ موجودات کے تجزیہ میں جہاں تک کثرت تھی انسان کہتا گیا کہ یہ مرکب فلاں اجزاء سے بنا ہے اور وہ فلاں سے۔ تہ پر جا کر جہاں کثرت ختم ہوگئی اور تمام عناصر کی اصل ایک پائی گئی وہاں حیران ہے کہ ایک سے مختلف خواص کے بیانوے عناصر کیونکر بن گئے۔

انسان کے ذہن میں صرف تین صورتیں آتی ہیں (۱) کہ دنیا خدا سے نکلی (۲) کہ خود خدا نے دنیا کی شکل اختیار کی (۳) خدا کا انکار کرکے صرف عالم کو مانا جائے کہ وہ خود بخود ہے۔ (۱) اگر دنیا خدا سے نکلی تو خدا ایک نہ رہا دو حصوں میں بٹ گیا (۲) اگر خدا نے خود دنیا کی شکل اختیار کی تو چونکہ دنیا میں متعدد اشیاء پائی جاتی ہیں خدا میں کثرت ماننی پڑتی ہے۔ وہ خالص ایک نہ رہا کئی اجزاء سے مرکب ہوا۔ اور مرکب ہوا تو حادث بھی ہوا اور فانی بھی۔ (۳) اگر یہ مانا جائے کہ عالم خود بخود ہے تو عالم کو سمجھنے میں پھر بعینہٖ اسی مشکل کا سامنا ہے جو خدا کو سمجھنے میں تھی۔ کیونکہ تجزیہ عالم سے اس کی اصل

ایک پائی گئی ہے۔ اور خالص ایک کا تصور کرنے سے انسان عاجز ہے۔ اس ایک کا نام خدا رکھو یا عالم بات ایک ہی رہی۔ الغرض انسان صرف وہاں تک جاسکتا ہے جہاں تک کثرت ہے۔ اور کثرت تبدیلی بے ثباتی۔ اور فنا کا نام ہے۔ ثبات خالص ایک کو ہے اور خالص ایک کو سمجھنے سے انسان قاصر ہے۔

(۲) انسان کی رسائی اس ایک تک ہے جس سے کثرت صادر ہو رہی ہے۔ چونکہ کثرت کو تغیر اور فنا لاحق ہے ہر انسان اس بات پر مجبور ہے کہ اس کثرت والے ایک کے اوپر خالص ایک کا جسے ثبات ہے اور جس کے دم سے یہ کثرت والا ایک قائم ہے۔ اقرار کرے اگرچہ خالص ایک جو ثابت ہے انسان کے فہم و ادراک سے باہر ہے۔ اس کثرت والے ایک اور خالص ایک میں جو تعلق ہے یعنی جس طرح خالص ایک نے اسے پیدا کیا ہے۔ اور جس طرح اسے قائم رکھ رہا ہے وہ ایک ایسا راز ہے جسے میں نہیں سمجھ سکتا۔ مجھے اتنا دکھائی دیتا ہے کہ اصل عالم ایک ہے۔ ایسی ایک جس میں الکٹرونز اور پروٹونز یا ان سے بھی اگر کوئی نیچے منزل ہو تو اس سے لے کر عالم کی چوٹی تک مادی و غیر مادی ہر شئے جو انسان کے خیال میں آتی ہے یا آئندہ آئے۔ مکان و زمان۔ تدبیر و ترتیب۔ میل و منافرت۔ تغیر و تخریب سمیت مخفی ہے۔ اور اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اس ایک کا نام جس میں سارا عالم اول سے آخر تک شامل ہے میں ارادۃ اللہ رکھتا ہوں۔ یہ تخم عالم کا بیج ہے اس فرق کے ساتھ کہ جہاں درخت کا بیج اگرچہ سارا درخت اپنے اندر مخفی رکھتا ہے اپنے سے باہر کی

بہت چیزوں مثلاً زمین کا، پانی کا، حرارت اور روشنی کا اور اپنے پھیلاؤ کے لئے مکان اور نشو و نما کے لئے وقت کا محتاج ہے۔ یہ شجر عالم کا بیج خود ہی مکان و زمان پیدا کرتا ہے۔ خود ہی اپنی ضرورت کی ہر چیز اپنے اندر سے مہیا کرتا ہے۔ اور اپنی ضرورتوں کو خوب سمجھتا ہے۔ ہر چیز کو حسب ضرورت اپنے اندر سے نکالتا رہتا ہے۔ صفات ظہور استعداد کو کہتے ہیں۔ چونکہ ساری استعدادیں اس میں مخفی ہیں اس واسطے تمام صفات اس کے ظہورات ہیں۔ اور سارے نام اس کے ہیں۔ یہی خلق کرتا ہے۔ یہی تقدیر کرتا ہے یہی ہیمن ہے یہی اول ہے۔ یہی آخر ہے۔ یہی ظاہر ہے۔ یہی باطن ہے۔ جو کچھ ہے یہی ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایسا مکمل ہے جیسے گول دایرہ۔ اس کے تمام ظہورات کیا مجموعی حیثیت میں اور کیا انفرادی حیثیت میں گول ہیں۔ چنانچہ مادہ کا ابتدائی ذرہ گول، زمین گول۔ سورج گول۔ چاند گول۔ انسان کا سر گول۔ بازو پنڈلیاں انگلیاں گول۔ مرغی سے انڈا اور انڈے سے مرغی۔ درخت سے بیج اور بیج سے درخت۔ سمندر سے بادل اور بادل سے بارش۔ بارش سے دریا۔ دریا پھر سمندر میں مثلث مستطیل، مربع وغیرہ تمام شکلیں دایرہ سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی پر ختم ہوتی ہیں۔ دایرہ کے مختلف نقطوں کو ملانے والے سیدھے خط کھینچ کر جو شکل چاہو بنا لو۔ اور پھر ان شکلوں کو زاویوں سے گول کر کے یعنی ان کی کثرت کو وحدت میں بدل کر دایرہ بنا لو۔ غرض ہر چیز گول ہے۔ نہ صرف ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر گول ہے۔ بلکہ عالم اپنی مجموعی حیثیت میں بھی گول ہے۔ گول چیز کے مکمل ہونے کا راز اس کی

وحدت ہی ہے۔ اس کا گھیرا کل ایک خط سے بنا ہے جو کہیں ٹوٹا ہُوا نہیں۔ بخلاف اس کے باقی تمام شکلوں کے گھیرے کئی خطوط سے بنتے ہیں جن کو زاویے جوڑتے ہیں۔ چونکہ گول چیز اپنے آپ میں مکمل ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں۔ وہ اپنے سے باہر کسی اور چیز کی طرف راہنمائی نہیں کر سکتی۔ اس واسطے انسان عالم میں کسی چیز کی بھی حقیقت نہیں پا سکتا۔ صرف اشیاء کے باہمی تعلقات کو اتنا سمجھتا ہے کہ ہر چیز کو دوسری اشیاء کے حوالہ سے بیان کرتا ہے۔ حقیقت کسی کی بھی نہیں جانتا۔ تمام اشیاء کی حقیقت ایک ہے اگر انسان عالم کی کسی ایک چیز کی حقیقت بھی جان سکتا۔ تو یہ سارے عالم کی حقیقت کو پا لینے کا مترادف ہوتا۔ ارادہ اور اس سے پیدا شدہ تدبیر عالم کے چپے چپے میں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ دریائے ارادہ گول چکر میں بہ رہا ہے۔ اس کا منبع یعنی صاحب ارادہ دکھائی نہیں دیتا۔ صاحب ارادہ کو پانے کی ساری کوششوں کا جواب یہ ملتا ہے ؎

برو ایں[1] دام بر مرغ دگر نہ کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ جو انسان کے فہم میں آ گیا اور اس کے احاطہ علمی سے محدود ہو گیا وہ لامحدود خدا کیونکر ہُوا پس زیادہ سے زیادہ علم جو انسان خدا کے بارے میں حاصل کر سکتا ہے۔ یہ ہے کہ خدا اس کی عقل و فکر کی دسترس[3] سے باہر ہے۔

[1] برابر ۔ [2] جا یہ جال کسی اور پرندہ کے لئے لگا عنقا کا گھونسلا اونچا ہے وہاں تک تیری پہنچ نہیں ۔ [3] پہنچ ۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم | و ز ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت بپایاں رسید عمر | ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

خدا کی ضرورت

ایک طرف یہ ہے کہ انسان کی خدا تک رسائی نہیں۔ دوسری طرف انسان پر ایسے اوقات آجاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ اپنے آپ میں کمی محسوس کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو اس کی کمی کو پورا کرے۔ ظاہر ہے کہ اس کی کمی کو اگر کوئی پورا کر سکتا ہے تو وہی کر سکتا ہے جس نے اس میں یہ کمی رکھی ہے۔ اس واسطے انسان تڑپتا ہے کہ اگر کہیں اس کا پتہ مل جائے جس نے اس کی کل کو بنایا ہے۔ تو اس سے اس کل کی سلامت روی اور خوش حالی کی بابت ہدایات حاصل کر کے اپنی کمی کو پورا کرے۔

خدا کی معرفت کا رستہ

اس مایوسی کے عالم میں ایک رستہ اسے سوجھتا ہے۔ وہ یہ کہ صانع کو اس کی صنع میں مطالعہ کیا جائے۔ صنعت صانع کے ارادہ کاریگری اور لیاقت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور اسی سے اس کی صفات کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اس وقت اسے دکھائی دیتا ہے۔ کہ وہ یونہی خدا کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ واقعہ میں صحیح رستہ تو اس کی معرفت کا یہی تھا۔ کیونکہ صانع کو محض دیکھ لینے یا گلے مل لینے سے بھی یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ اس میں کیا کیا کاریگریاں اور صفات چھپی پڑی ہیں۔ بالفرض اگر خدا تک رسائی ممکن بھی ہوتی۔ اور انسان خدا کے حضور پہنچ بھی جاتا۔ اس کی زیارت بھی کر لیتا۔ تب بھی اسے کچھ

معلوم نہ ہو سکتا کہ خدا کیا ہے۔ بلکہ خدا اگر اسے اپنی مرضی بتا بھی دیتا تب بھی وہ خدا کی باتوں کو نہ سمجھ سکتا اور یوں عرض کرتا کہ اے میرے مولا! میری کمزوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یا خود انسانی سطح پر اُتر کر اپنی ہدایات پر عمل در آمد کا نمونہ دیجیئے یا کوئی ایسا انسان پیدا کیجیئے جو حضور کے قائم مقام کی حیثیت سے ایسا نمونہ دے۔ تاکہ میں حضور کے منشاء مبارک کو سمجھ سکوں اور اس کی پیروی کر سکوں۔

مظہر ارادۃ اللہ

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ عالم ایک درخت ہے جو ارادۃ اللہ کے بیج سے پھوٹا ہے۔ اس درخت کے چپہ چپہ پر ارادۃ اللہ کے پیش نظر اپنے آپ کو ظاہر کرنا تھا اور یہ مقصد آخر پر آ کر انسان میں جو اس کی خلق کا بہترین نمونہ ہے پورا ہوا سو انسان اگر ضرورت محسوس کرتا ہے کہ خدا کی مرضی ارادۃ اللہ کا ظہور انسان کے ذریعے ہو تو ارادۃ اللہ نے خود ہی یہی پسند فرمایا ہے کہ اپنے آپ کو انسان کے ذریعہ ظاہر کرے۔ اور اسی غرض کے لئے سارا کارخانہ رچایا ہے۔ اس مقام پر انسان سے مراد انسان کامل ہے جو صحیح معنوں میں انسان ہے اپنے ہم جنسوں کو خدا کی مرضی پر عملدر آمد کا نمونہ دینے کے لئے ہر زمانہ میں ایسا انسان کامل ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ جو دوسرے انسانوں کے درمیان رہ کر خدا کی مرضی کو ایسی وفاداری اور خوبی سے پورا کرتا ہے جیسے اگر خدا خود انسان کی جگہ پر ہوتا تو اپنی مرضی کو پورا کرتا۔ یہ انسان خدا کا رسول اس کا منبع۔ اس کا مظہر یا اوتار۔ اس کا قائم مقام یا نمائندہ کہلاتا

ہے۔ اور خدا کے اس قایم مقام کی اطاعت عین اطاعت اللہ ہے جس نے خدا کی معرفت کو حاصل کرنا۔ اس کی مرضی کو پانا۔ اور اس پر چلنا ہو۔ وہ خدا کے اس قایم مقام کی طرف توجہ کرے۔ اور اس کی پیروی کرے۔ اس کے قایم مقام خدا ہونے کا راز اس کی عبودیت میں ہے۔ عبودیت اس کی گھٹی میں اسطرح رچی ہوتی ہے۔ کہ وہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ چونکہ وہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس کی ہر حرکت وسکون خدا کی اپنی حرکت وسکون ہوتی ہے۔ اور اسی لئے وہ خدا کا قایم مقام کہلاتا ہے

عبودیت اور خدا کی قایم مقامی ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں کامل عبودیت کے بغیر خدا کی قایم مقامی ناممکن ہے۔ اور خدا کی قایم مقامی کی صلاحیت کے بغیر عبودیت کا جو حق ہے ادا نہیں ہو سکتا پس اگر وہ کہے کہ میں عبد ہوں تو صحیح کہتا ہے۔ بلاشبہ اس کے برابر کوئی عبد نہیں اور اگر وہ کہے کہ میں رسول اللہ ہوں تو بلاشبہ صحیح ہے کیونکہ خدا نے ہی اسے ایسا عبد کامل بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ کہ خدا کی مرضی اور اس کی صفات کا وہ آئینہ دار ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ میں خدا کا قایم مقام ہوں یا خدا ہوں تو یہ بھی بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ وہ فی الواقع وہ ارادۂ اللہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اور کوئی نہیں جو اس سے بڑھ کر خدا کی صفات کا مظہر ہو۔

یہ مظہر کامل ایک آئینہ ہے جس میں خدا کی صفات صاف صاف منعکس ہو رہی ہیں۔ اس کی ہستی خدا کی ہستی [illegible] اس کے بے نظیری خدا کی یکتائی پر۔ اس کی بے غرض تربیت عالم خدا کی ربوبیت [illegible]

اس کی قوت ارادی خدا کے ارادہ پر ۔ ظلم کا اسے جھکا نہ سکنا خدا کی بے پناہ قدرت پر ۔ اس کا اثر و نفوذ خدا کی خلاقیت پر اور آخر پر ساری دنیا کے مقابلہ میں تن تنہا اپنے مقصد میں کامیاب ہوجانا یعنی اپنی تعلیم کو قائم کردینا خدا کی مشیئت کے غلبہ پر دلیل ہوتی ہے ۔ اس کا عرفان خدا کا عرفان ہے ۔ عرفان سے خدا کی ذات کا نہیں ۔ بلکہ اس کی صفات کا عرفان مراد ہے ۔ اور خدا کی صفات کہاں تلاش کرنی ہیں ؟ خدا کے مظہر کامل یا نمائندہ یا رسول ہیں مظہر کامل بھی نوع انسا[illegible]ں سے ہے ۔ جو چوٹی پر ہے ۔ دوسرے انسانوں میں بھی ان صفات کا جو اس میں ظاہر ہیں ایک نہ ایک حصہ بطور تخم یعنی مخفی استعداد کے طور پر موجود ہوتا ہے ۔ ہر فرد انسانی کا فرض ہے کہ مظہر کامل کے نمونہ اور پیروی سے فائدہ اٹھا کر مظہر کامل کی صفات کے اس حصہ کو جو خود اس انسان میں مخفی استعدادوں کے طور پر ودیعت ہے نشو و نما دلوے تاکہ اس سے بھی اپنی حد استعداد کے اندر مظہر کامل کی سی صفات ظاہر ہونے لگیں ۔ اپنی استعدادوں کو ایسی نشو و نما دینے اور اپنی طاقت کے مطابق مظہر کی سی صفات خود اپنے سے ظاہر کرنے کا نام ہی عرفان ہے ۔ خدا کی ذات تو اپنے ماسوا کے عرفان سے ارفع ہے ۔ انسان خدا کی اس تجلی کا عرفان حاصل کرسکتا ہے ۔ جو خدا نے خود اس کی ذات میں رکھی ہے ۔ پیغمبر اسلام[1] علیہم الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچانا ۔ اس نے خدا کو پہچانا ۔

[1] اصل الفاظ یہ ہیں ۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ

خلاصہ کلام یہ کہ خدا اپنی تنزیہی بلندیوں پر بحال رہتے ہوئے اور اپنے ظہور کی کیفیت کے راز کو فاش نہ کرتے ہوئے انسان کامل کے ذریعہ اپنے آپ کو پورے طور پر ظاہر کر دیتا ہے۔ اور طالبوں کو اس کی معرفت گھر بیٹھے بٹھائے حاصل ہو سکتی ہے۔

مرجع صفات ۔صفات اگرچہ انسان کامل سے ظاہر ہوتی ہیں واقعہ میں وہ ظہور الٰہی ہیں۔ انسان صرف انکے ظہور کا ذریعہ یا آلہ ہے۔ انسان کے آلہ ظہور بننے کی وجہ جیسے کہ پہلے عرض ہوا اس کا اپنے ارادہ کو ارادہ الٰہی پر قربان کر دینا ہے۔

فانی اند آلۂ ربانی اند نور حق در جامۂ انسانی اند

آئینہ گو انسانی ہے ظہور الٰہی ہے جامہ انسانی ہے پر جامہ میں نور خدا ہے آئینہ نہ ہو تو ظہور نہ ہو۔ ظہور نہ ہو تو آئینہ نہ ہو۔ ظہور کو نہ تو خدا سے الگ کر سکتے ہیں نہ آئینہ سے اس واسطے یہ ظہور وہ مبارک مقام ہے جہاں انسان اور خدا میں ملاپ ہوتا ہے۔ اس ظہور کا نام انسانیت کاملہ بھی ہے اور نور خدا بھی۔ یہ ظہور بیک وقت انسانی صفات بھی ہیں اور خدا کی صفات بھی۔ اس ظہور کا دیدار خدا کا دیدار بھی ہے اور انسان کامل کا دیدار بھی ؎

گر نہ دیدہ استی خدا او را ببیں + من رآنی فقد رأی الحق بالیقیں

سو انسان کامل خدا نہیں ہر خدا سے جدا بھی نہیں۔ ناظرین کرام سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان کامل سے مراد اس کا گوشت پوست نہیں بلکہ وہ ظہور ہے جو ہیکل انسانی کے ذریعہ ہوتا ہے اس واسطے اس کے دیدار سے مراد اس کی ظاہری ملاقات نہیں بلکہ ظہور الٰہی کی شناخت مراد ہے

چونکہ صفت ظہور کو کہتے ہیں اور موصوف مظہر ظہور کو اگرچہ ارادہ الہٰی خدا سے الگ نہیں صفات کو عالم امر میں ارادہ الہٰی اور عالم خلق میں انسان کامل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کے مفصل وجوہات حسب ذیل ہیں:۔

(۱)۔ جیسے کہ اوپر عرض ہوا۔ صفات کثیر ہیں۔ اور کثرت فانی ہے۔ فانی کو باقی کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔

(ب)۔ ذات باری کنز مخفی ہے مخفی ہونے کے باعث وہ لا یدرک[۱] ہے اور لا یدرک ہونے کے سبب لا یوصف[۲]۔ کوئی صفت اس کی طرف منسوب کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ مخفی ہے نہ لا یدرک۔ یہ اجتماع ضدین ہے ہے۔ یہ اعتراف کرنے کے بعد کہ وہ ہمارے ادراک سے بالا ہے۔ اور ہم اسے جان نہیں سکتے ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہم اس کی طرف کوئی صفت منسوب کریں۔

(۳)، جو صفات ہم تصور اور منسوب کرنے کے قابل ہیں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے خواہ وہ کتنی ہی اعلےٰ و ارفع کیوں نہ ہوں۔ وہ خدا کے شایاں شان نہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم کہیں کہ وہ لاثانی ہے۔ تو ہم اس کی طرف وہ مفہوم منسوب کریں گے جو ہم لاثانی کے لفظ سے سمجھتے ہیں ہم ایک چیز کو لاثانی اس وقت کہتے ہیں جب کئی چیزوں میں باہمی اشتراک[۳] و مقابلہ تو موجود ہو لیکن ان میں سے ایک اپنے تمام باقی شرکاء پر مشترکہ خوبی کی کثرت کے باعث فائق ہو۔ یہ ہوا خدا کے علاوہ ایسی ہستیوں کا اقرار جو خدا کے مقابل ہیں۔ حالانکہ مقابلہ تو درکنار خدا کے حضور کسی چیز کی

---

[۱] جو سمجھ میں نہ آئے [۲] جس کی صفت بیان نہ کی جا سکے [۳] حصہ داری

ہستی ہی کوئی نہیں اور سب کچھ عدم محض ہے
اسی طرح اگر ہم کہیں کہ خدا حیی (زندہ) ہے تو ہم زندگی کا اپنا تصور اس کی طرف منسوب کریں گے زندگی کی بہترین شکل جس کا ہمیں علم ہے انسان ہے جو کہ گوشت پوست کا پتلا ہے۔ ناظرین بلا تامل اقرار کریں گے کہ ایسی زندگی خدا کے شایان شان نہیں۔ اگر ہم کہیں کہ خدا غضبناک ہے۔ تو ہم خدا پر اس چیز کا اطلاق کریں گے جو انسانی زبان میں غضب کہلاتی ہے۔ ہم کسی انسان کو غضبناک اس حالت میں کہتے ہیں جب اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو۔ اس کی طبیعت میں اشتعال ہو۔ اور اس کی حرکات معمول کے برخلاف ہوں۔ کیا ہم ایسی حالت خدا کیطرف منسوب کر سکتے ہیں؟ چونکہ ذات باری ہماری ہیچ سے باہر ہے۔ جو صفات ہم تجویز و تصور کریں گے لازماً ان کا اطلاق مظہر الہی پر ہوگا نہ کہ ذات اللہ پر۔

(د) ہم کہتے ہیں کہ گلاب کا پھول خوبصورت اور خوشبودار ہے۔ ہم یوں نہیں کہتے کہ گلاب کا بیج یا خاردار جھاڑی جیسے پھول لگتا ہے خوبصورت اور خوشبودار ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر خوبصورتی اور خوشبو گلاب کے بیج یا پودہ میں پنہاں نہ ہوتی۔ تو پھول میں ظاہر نہ ہو سکتی۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ خواہ ہم بیج کو یا شاخ کو خوبصورتی اور خوشبو کی تلاش میں چھوٹے چھوٹے ذروں میں کاٹ ڈالیں ہم اس میں ان خاصوں کا سراغ نہیں پائیں گے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ خوبصورتی اور خوشبو بیج میں اس کے پھول کی شکل میں آنے

سے پہلے مخفی خاصوں کے طور پر موجود تھی۔ تو ہم وہ چیز کہہ رہے ہوتے ہیں جس کی طرف پھول کے مشاہدہ نے ہماری رہنمائی کی ہے۔ نہ وہ جو براہ راست بیج کے مشاہدہ سے ظاہر ہے۔ اگر پھول جس میں یہ صفات ظاہر ہوئی ہیں نہ ہوتا تو یہ کبھی معلوم نہ ہو سکتا کہ بیج میں خوبصورتی اور خوشبو کے خاصے مخفی تھے۔ بظاہر صفات جو پھول میں موجود ہیں بیج میں مفقود تھیں اور بیج کے پھول کی شکل میں آنے کے ساتھ وجود میں آئیں۔ پس سرخی۔ نرمی۔ خوشبو پھول کی صفات کہلائیں گی نہ کہ بیج کی۔ جب کبھی ان خاصوں کو بیج کی طرف منسوب کیا جائے گا۔ پھول کی وساطت[1] سے کیا جائے گا نہ کہ براہ راست۔ کیونکہ بیج کی طرف ان کو نسبت دینے کی سند یعنی اس بات کی شہادت کہ یہ بیج میں بالقوۃ موجود تھے پھول سے ہم پہنچتی ہے جہاں یہ صفات ظاہر ہیں۔ مظہر ارادۃ اللہ کو کو پھول کی جگہ پر اور ذات اللہ کو بیج کی جگہ پر رکھنے سے صاف عیاں ہے کہ تدبیر۔ خلق۔ نظم۔ علم۔ قدرت۔ رحم۔ عقل اور بینائی وغیرہ صفات مظہر ارادۃ اللہ کی طرف ہی جہاں وہ ظاہر ہوئی ہیں منسوب ہوں گی نہ کہ ذات اللہ کی طرف۔

تنبیہ :۔ اس مثال سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ جس طرح بیج اپنی حالت بدل کر پودا اور پھول بنتا ہے خدا بھی اپنی حالت بدلتا ہے۔ یاد رہے خدا اپنی ذات میں کسی قسم کا تغیر قبول کئے بغیر پُراسرار طریق سے جو انسان کے عقل و فہم سے بالا ہے۔ ارادۃ اللہ کو مہیا فرمایا ہے جس کا مظہر انسان کامل ہے۔

[1] وسیلہ سے ؛

پیغمبر کے مظہر الٰہی ہونے پر اعتراض کا ازالہ

بعض احباب کو پیغمبر کے کامل مظہر خدا ہونے سے انکار ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ پیغمبر بہت بڑا انسان ہے۔ پر اس کو خدا سے کیا نسبت؟ وہ خدا کی ساری صفات کا آئینہ دار نہیں ہوتا۔ اور جن کا ہوتا ہے اُن کو بھی بہت ادنےٰ پیمانہ پر ظاہر کرتا ہے خدائی صفات ان سے بہت ارفع اعلےٰ ہیں۔ یہ ادعوے ایسا ہے کہ گویا انہوں نے خدا کی صفات جو پیغمبر کی صفات سے بہت ارفع و اعلےٰ ہیں کہیں دیکھی ہوئی ہیں اور پیغمبر کی صفات کا ان ارفع و اعلےٰ صفات سے مقابلہ کرکے بتلا رہے ہیں کہ یہ ادنےٰ ہیں اور وہ اعلےٰ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کرۂ ارض پر صنع خداوندی کا بہترین نمونہ انسان ہی ہے۔ اور پیغمبر انسانیت میں تمام نسل انسانی کی چوٹی پر ہے۔ تو اگر وہ صفات جو پیغمبر میں ظاہر ہیں ادنےٰ ہیں۔ تو اعلےٰ ان کو کہاں ملاحظہ کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ کیا پیغمبر مغرب سے نکال سکتا ہے؟ نہایت ٹیڑھا سوال ہے۔ پیغمبر مغرب سے تب سورج نکالے جب وہ خدا کا مخالف ہو۔ جب پیغمبر ارادۃ اللہ کا حصہ ہے اور اسکا ارادہ خدا کا ارادہ ہے اور خدا کا ارادہ اسکا ارادہ ہے اور اسی اتحاد نے اسے پیغمبر بنایا ہے تو وہ خدا کی خلاف ورزی کے ارتکاب کا مطالبہ کب پورا کرنے لگا؟ وہ لوگوں کو خدا کے ارادہ سے موافقت سکھانے آیا ہے نہ کہ مخالفت۔

اگر وہ ایسا ہوتا کہ لوگوں کے ایسے مطالبوں سے خدا کی خلاف ورزی پر آمادہ ہو سکتا تو خدا اسے پیغمبر بناتا ہی نہ۔ وہ کب کہتا ہے کہ خدا کے بالمقابل مجھے کسی طاقت کا دعوے ہے۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ جو کچھ ہے خدا ہی ہے۔ میں لاشئ محض ہوں۔ اس کے کچھ نہ ہونے

نے ہی تو اسے خدا کا قائم مقام یا پیغمبر بنایا ہے۔ یہ اس کی اپنی نیستی
کے ہی تو بیان ہوتے ہیں جنہیں غلط فہمی سے لوگ اس کی طرف سے
دعوے الوہیت سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اگر زمین خدا کے ارادہ سے قائم ہے
اگر سورج خدا کے ارادہ سے چمک رہا ہے۔ اگر بارشیں خدا کے ارادہ
سے برس رہی ہیں۔ تو چونکہ پیغمبر کے ارادہ اور خدا کے ارادہ میں فرق
نہیں۔ سب کچھ اسی کے ارادہ سے ہو رہا ہے۔ جب پیغمبر اور خدا قاب
قوسین کے مقام پر ہیں جہاں ان میں دوئی نہیں۔ تو یہ کہنا کہ سب کچھ
خدا کے ارادہ سے ہوتا ہے۔ یا یہ کہ سب کچھ پیغمبر کے ارادے سے ہو رہا ہے ایک ہی بات ہے۔

خدا کی طاقت کا ظہور:۔ اگر پیغمبر خدا کا مظہر کامل ہے تو اس کے کام میں
جو مشکلات کے پہاڑ سامنے آ جاتے ہیں، انہیں کیوں خدائی طاقت سے دور نہیں
کر دیتا؟ یہ تو مسلمہ ہے کہ تعلیم و تربیت کا کام پیغمبر کا اپنا کام نہیں خدا کا کام ہے جو اس کے حکم
سے شروع کیا گیا ہے۔ جب خدا کے کام میں مشکلات آتی ہیں تو خدا اپنی
براہ راست قوت سے کیوں ان مشکلات کو اڑا نہیں دیتا؟ اگر پیغمبر میں یا
خدا کی طاقت کا ظہور ہے تو وہ ان مشکلات کو دور کر سکتا ہے تو خدا
کا اور بھی زیادہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ پیغمبر کو کام سپرد کر کے اور اسے مشکلات
میں ڈال کر بیٹھ نہ رہے۔ ان مشکلات کو دور کرے۔ بات یہ ہے کہ خدا کو
یہ منظور ہی نہیں کہ جبری اور قہری طاقت سے لوگوں کو ہدایت پر لائے۔ اس
نے اپنی مرضی سے بندوں کو ایک حد تک اختیار دیا ہے۔ اور اس دیئے
ہوئے اختیار کو سلب کرنا نہیں چاہتا۔ جو کام مجبوری سے کیا جائے وہ
اس کا کام ہے جو مجبور کرنے والا ہے۔ نہ کہ مجبور کا۔ بے شمار مخلوق ایسی
ہے جو مجبوری سے اطاعت کر رہی ہے مثلاً سورج چاند وغیرہ۔ بندے کو

خدا نے اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ سمجھ کر کہ اطاعت میں خوبی ہے ارادہ سے اطاعت کرے جو اصل اطاعت ہے۔ انسان سمجھتا ہے تجربے سے اس واسطے خدا کا اپنا ارادہ یہ ہے کہ وہ بندوں کے ارادوں کو نہ معطل کرے نہ تجربہ سے علم سیکھنے کے رستہ کو بند کرے۔ وہ جان بوجھ کر بندوں کو چھوڑ دیتا ہے۔ کہ وہ جتنی چاہیں مشکلات پیدا کریں اور جتنا چاہیں مظہر پر ظلم کریں اور اس تجربہ میں آخرکار ناکام ہو کر اس بات کا علم حاصل کریں کہ پیغمبر میں واقعی خدا کی طاقت ہے جس کو ان کا ظلم جھکا نہ سکا اور آخر وہی کامیاب ہوا۔ مشکلات کو غیر معمولی جبری طاقت سے دور نہ کرنے میں طاقت نمائی اور انسان کو تجربہ سے علم سکھانا مقصود ہے۔ بموجب خدا کا اپنا ارادہ ہے کہ بندے ایک وقت تک کھل کھیلیں۔ اور اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لیں کہ ان کا زور پیغمبر کو کمزور اور ناکام نہیں کر سکتا۔ تو پیغمبر خدا کے ارادہ کے خلاف کیسے عمل کر سکتا ہے۔ کہ وہ آن کی آن میں مخالفت کو پاش پاش کر کے رکھ دے۔

پیغمبر کی دعائیں

اگر پیغمبر خدا کا مظہر کامل ہے تو وہ دعائیں کیوں کرتا ہے؟ اور اس کی ساری دعائیں منظور کیوں نہیں ہوئیں؟ یہاں تو صاف اس کا ارادہ دکھائی دیتا ہے کہ یہ کام ہو جائے۔ پھر وہ کیوں نہیں ہوتا؟

میں یہ پہلے عرض کر آیا ہوں کہ پیغمبر کو پیغمبر بنانے والی چیز اس کی عبودیت تامہ ہے۔ اور دعا لازمہ عبودیت ہے۔ اس واسطے پیغمبر کا دعائیں کرنا اس کی شان کے عین مطابق ہے مخالف نہیں۔ پیغمبر تربیت عامہ کے لئے آتا ہے اور اس کی زندگی عوام کے لئے نمونہ ہوتی ہے۔ عام لوگوں کی دعاؤں نے

کبھی قبول ہونا ہوتا ہے۔ کبھی نہیں ہونا ہوتا۔ اگر پیغمبر کی ساری زندگی میں دعا قبول نہ ہونے کا کوئی نمونہ نہ ہو تو اس کے ماننے والوں پر ان کی دعاؤں کا قبول نہ ہونا بے حد شاق ہو۔ اور وہ بددل ہو جائیں ایمان کیا ہے؟ خدا سے وفاداری کا معاہدہ۔ اور وفاداری کا جو امتحان دوسرے فریق کی سرد مہری کے وقت ہوتا ہے دوسرے وقت نہیں ہوتا پیغمبر کی بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے میں اُمت کے لئے پیغمبر کی کمال وفاداری کا نمونہ چھوڑنا مقصود ہوتا ہے تاکہ ان کی دُعا رد ہونے کے وقت ان کی ہمت ہارنے نہ پائے۔ چونکہ بعض دعاؤں کا قبول نہ ہونا اس مصلحت سے ہوتا ہے اور پیغمبر اس مصلحت سے ناواقف نہیں ہوتا اس کی دعا قبول نہ ہونے پر اسے ذرہ برابر خدا سے گلہ نہیں ہوتا بلکہ بیش از پیش ہمت کے ساتھ دادِ وفاداری دیئے جاتا ہے

پیغمبر کی کامیابی

پیغمبر اپنے بعض ارادوں میں ناکام کیوں رہتا ہے؟ پیغمبر کے کئی ارادے نہیں ہوتے اس کا صرف ایک ارادہ ہوتا ہے۔ اصلاح عالم۔ اور وہ اپنی اصلاحی تحریک کو قائم کرنے میں کبھی ناکام نہیں رہتا۔ اگر ناکام رہے تو پیغمبری کا جھوٹا دعویدار ہے۔ یاد رہے کہ اصلاحی تحریک کی کامیابی کے لئے سیاسی غلبہ ضروری نہیں جب پیغمبر اصلاح کا کام شروع کرتا ہے سخت مخالفت بھڑک اٹھتی ہے۔ اور مخالفت کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ اس کی تحریک کے پودے کو سر نکالتے ہی کچل دیا جائے۔ اس مخالفت کا اس کی تحریک کو جڑ پکڑنے سے روک نہ سکنا اور اصلاحی تحریک کا جڑ پکڑ جانا ہی پیغمبر کی کامیابی ہے۔ پھر وہ تحریک خواہ اس کی

زندگی میں پھلے پھولے خواہ اس کے بعد۔ خواہ جلد۔ خواہ دیر سے اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

پیغمبر انسان کامل کیونکر ہے؟

سوال ہوتا ہے کہ پیغمبر تمام علوم و فنون میں مہارت نہیں رکھتا بلکہ خود وہ دوسرے ماہرین کی امداد کا محتاج ہوتا ہے مثلاً جب بیمار ہوتا ہے اسے ماہر طب کی امداد لینا پڑتی ہے وغیرہ۔ کیا تمام علوم و فنون انسانی مانگیں نہیں؟ اگر ہیں تو جب تک کوئی فرد ان سب میں کامل نہ ہو اسے کامل انسان کیونکر کہہ سکتے ہیں؟

کچھ شک نہیں کہ تمام علوم و فنون انسانی استعدادوں کے ظہورات ہیں اور ان سب کی تربیت انسان کامل کے کام میں داخل ہے۔ اس رسالہ میں بار بار عرض ہو چکا ہے۔ کہ ہر کثرت اپنی مرکزی وحدت سے قائم ہے۔ انسان کی بے شمار استعدادوں کے لئے ایک مرکزی استعداد ہے۔ جو ان سب کے لئے بطور جڑ کے ہے اور جس سے یہ سب شاخیں پھوٹتی ہیں۔ پیغمبر شاخوں اور پتوں کو ہاتھ ڈالنے کی بجائے جڑ کے راستے سارے درخت کی پرورش کرتا ہے جو درخت کی شاخوں اور پتوں کی پرورش کا طبعی طریق ہے۔ وہ جڑ کیا ہے؟ استعداد انسانیت۔ اگر اس جڑ کی تربیت ہو گئی تو پتے پتے کی خود بخود تربیت ہو گئی۔ اگر اس کی تربیت نہ ہوئی تو درخت کے کسی حصہ کی بھی تربیت نہ ہوئی۔ ماہر طب ہونا بیشک بہت بڑا کمال ہے لیکن ضروری نہیں کہ ہر ماہر طب انسانیت کا پتلا بھی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ بدمزاج ہو۔ لالچی ہو۔ اس کی مہارت خود اس کے لئے اور دوسروں کے لئے مفید ثابت نہ ہو۔ ہماری آنکھوں کے سامنے چھ سال جنگ ہوتی رہی

ہے۔ اس جنگ میں جس قدر نقصان جان اور مال کا ہوا ہے بسا لقہ زمانوں کی جنگوں میں کبھی نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں علوم زوروں پر ہیں۔ علوم سے ایسے تباہ کن آلات حرب ایجاد ہوئے ہیں کہ انہوں نے دنیا کو جہنم بنا دیا ہے۔ علوم و فنون کو انسانی کمالات بنانے والی چیز انسانیت ہے۔ اگر انسانیت نہیں تو نہ علوم انسانی کمالات ہیں۔ نہ وجود میں آسکتے ہیں نہ ترقی کر سکتے ہیں۔ ہر علم و فن اس فن کے بیشمار افراد کی لمبی اور لگاتار کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور اس طبقہ کو جو ایک خاص فن کی تحصیل میں مصروف رہا ہے اس فن کے لئے فارغ کرنے میں باقی تمام نسل انسانی کی کوششوں کا دخل ہے۔ اگر افراد انسانی کا باہمی تعاون نہ ہوتا۔ تو نہ کوئی فن پیدا ہو سکتا نہ ترقی کر سکتا۔ پھر اگر انسانیت نہ ہو تو ایک ہی فن کے لوگ آپس میں اور نیز باقی فنون والوں کے ساتھ ٹکرائیں گے۔ ان کے علوم و فنون انہیں بھی ساتھ لے ڈوبیں گے۔ غرض اول تو انسانیت کے بغیر علوم و فنون کا وجود میں آنا محال ہے۔ اور دوسرے اگر وجود میں آ بھی چکے ہوں تو انسانیت کے بغیر باقی نہیں رہ سکتے پیغمبر فن انسانیت کو سامنے رکھتا ہے۔ اس میں کمال حاصل کرتا ہے۔ اس فن میں دوسروں کی تربیت کرتا ہے۔ اور اس طرح تمام علوم و فنون کی تربیت کا رستہ کھول دیتا ہے۔ چونکہ وہ انسانیت میں کامل ہوتا ہے۔ اور ہر ایک کمال انسانیت کے کمال سے وابستہ ہے۔ اس لئے وہ تمام علوم و فنون کا مربی بھی ہے اور انسان کامل بھی۔

علوم و فنون کی اس بالواسطہ تربیت کے علاوہ ان کی طرف وہ توجہ بھی دلاتا ہے۔ اور ان کی تحصیل پر زور بھی دیتا ہے۔ تحقیقات کی روح پیدا کرتا

ہے۔ علوم و فنون کی تحصیل کے رستہ میں جو رکاوٹیں ہوتی ہیں ان کو دور کرتا ہے۔ اور قوت ارادی کی مضبوطی کا جوہر علم و فن کی کنجی ہے۔ ایسا بے نظیر نمونہ دیتا ہے کہ سب کی استعدادیں اُبھر آتی ہیں۔ اُمنگیں پیدا ہو جاتی ہیں اور عالم ترقی کرنے لگتا ہے چنانچہ قرآن نے مطالعہ فطرت اور اس کی تسخیر کی طرف جو بار بار توجہ دلائی۔ علوم حاضرہ اسی کا نتیجہ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ تمام علوم پیغمبر کے نام لیوا ہی پیدا کریں۔ پیغمبر عالم کو ترقی کی طرف ایک عام دھکا دیتا ہے۔ اور اسکے دھکے کا اثر ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں گروہوں پر ہوتا ہے۔ اگر کسی بزرگ کے دل میں یہ خیال آئے کہ اگر عالم کی موجودہ تہذیب و تمدن پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تربیت کا نتیجہ ہے تو پرانی تہذیبیں مثلاً ہندو تہذیب کس کا نتیجہ تھی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ان مُربیانِ عالم کی تربیت کا نتیجہ تھی جو ہندوؤں میں آئے اور جنہیں وہ اوتار یا رشی کے مقدس ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

خدا انسان کے معاملوں میں دخل کیوں دیتا ہے؟

ایک اور سوال ہوتا ہے کہ خدا پیغمبر بھیج کر انسانی معاملوں میں کیوں دخل دیتا ہے۔ کیا دنیا کے لوگ اپنے علم، عقل اور تجربہ سے اپنا کام نہیں چلا سکتے؟ ہر اچھی بات کو جہاں سے بھی ملے لے لینا تو درست ہے لیکن ایک شخص کو ایسی حیثیت سے کیوں مانا جائے کہ اس کی ہر بات درست ہے خواہ وہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے؟ کیا اس سے مزید تحقیقات اور ترقی کا دروازہ بند نہیں ہو جاتا؟

واضح ہو کہ پیغمبر بھی انسان ہے اور اس کا علم، عقل اور تجربہ بھی انسانی علم، عقل اور تجربہ میں شامل ہے۔ ہر فرد ہر فن میں ماہر نہیں ہوتا۔ ہر فن

میں باقی افراد کو ماہر فن کی رائے لینا پڑتی ہے مثلاً اگر کسی کو بخار ہو جائے تو اس کے متعلقین اگرچہ یہ جانتے ہیں کہ بخار میں جسم گرم ہو جاتا ہے اور نبض تیز ہو جاتی ہے اور کو نین دیا کرتے ہیں۔ اس کے علاج کے لئے اپنے آپ پر اعتماد نہیں کرتے۔ بلکہ طبیب کو جو اس فن میں ماہر ہے بلاتے ہیں۔ اور یہ نہیں کہتے کہ طبیب کا کیا حق ہے کہ وہ ہمارے معاملہ میں دخل دے پیغمبر فن انسانیت کا ماہر ہوتا ہے جو سب فنون کی جڑ اور سب سے زیادہ نازک ہے۔ انسانیت عامہ کی بقاء کے لئے اس کا دخل طبیب کے دخل سے بدرجہا بڑھ کر زیادہ ہے۔ پیغمبر اور اللہ کی تیار کردہ تربیت عام کی اسی تجویز میں شامل ہے جیسے ہی طبیب اس فرق کو سمجھ لو کہ پیغمبر اس تجویز کا مرکز ہے اور طبیب اس کی شاخ ہے پیغمبر یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ مجھے اندھا دھند مان لو بلکہ اندھا دھند تقلید کے خلاف آواز اٹھانے والا وہ پہلا شخص ہوتا ہے۔ لوگ بے سوچے سمجھے کچھ باتوں کو مانے ہوتے ہیں۔ اور پیغمبر انہیں اپنے مسلمات پر غور و فکر کرنے کو بلاتا ہے۔ اور جو کوئی پیغمبر کو مانتا ہے اپنے پہلے مسلمات کا جائزہ لے کر اور تسلی کر کے ہی انہیں چھوڑتا ہے اور پیغمبر کو قبول کرتا ہے۔

جب تک لوگوں میں تحقیقات کی روح باقی رہتی ہے پیغمبر آتا ہی نہیں جس طرح جب تک کوئی بیمار نہ ہو طبیب علاج کے لئے نہیں آتا پیغمبر اپنے بارہ میں بھی ضروری اور جائز تحقیقات کی پوری پوری اجازت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اچھی طرح سے ٹھونک بجا کر دیکھ لو کہ جسد انسانیت کو فلاں فلاں بیماریاں لاحق ہیں کہ نہیں اور جو علاج میں ان کا بتاتا ہوں تمہارے سابقہ مسلمہ تجربات انسانیت کے نسخوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر تشخیص اور علاج اجمالی طور پر درست ہے۔ تو مجھے معالج کے طور پر قبول کر لو ورنہ نہ کرو

پھر جب انسان اصولی امور میں تحقیقات اور تسلی کر کے اسے پیغمبر یا مربی نسل انسانی مان چکتا ہے تو اب اس کا فرض ہے کہ فروعی باتوں میں سے چند اگر اس کی سمجھ میں نہ بھی آئیں۔ تو بھی ان پر اعتراض نہ کرے۔ اس موقعہ پر اس کا اعتراض ایسا ہی ہوگا جیسے ایک شخص پوری تسلی کر کے کہ حکیم حاذق ہے اور اس کی تشخیص بظاہر درست ہے علاج شروع کرے لیکن دوران علاج میں قدم قدم پر حکیم سے مطالبہ کرے کہ یا تو اس دوائی کے استعمال کی تمام مصلحتوں کا مجھے قائل کرا دو یا یہ دوائی نسخہ میں نہ ڈالو ظاہر ہے کہ ایک عامی کا حکیم حاذق سے ایسا برتاؤ نادانی ہے حکیم عمر صرف کر کے اپنے فن کی جن باریکیوں تک پہنچا ہے ان کا وہ ایک عامی کو جسے طب میں بہت ہی کم دخل ہے آن کی آن میں کس طرح قائل کرا سکتا ہے ساری تفصیلات جاننے کے لئے تو اس عامی کو بھی اتنی ہی محنت اور اتنا ہی وقت درکار ہے جتنی محنت اور جتنا وقت حکیم کو حاذق بننے میں درکار تھا۔

ناظرین کرام جانتے ہیں، کہ پیغمبر پہلا شخص ہوتا ہے۔ جو زمانہ کی رائے عامہ کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ اور اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالتا ہے کیا رائے عامہ سے یہ اختلاف پیغمبر کی آزادی فکر اور جذبۂ تحقیق کی پیداوار نہیں ؟ اگر ہے تو دوسروں کے فکر و تحقیقات کے جذبات کو دبانے کا موجب وہ کیونکر ہو سکتا ہے پیغمبر کی پیروی کو جائز آزادی فکر و تحقیقات کے خلاف جاننا پیغمبر سے حد درجہ کی بے انصافی ہے۔

یاد رہے کہ آخری اور قطعی تحقیق عملی تجربہ ہے ہر کام کو ہم ابتدائی اور سرسری تحقیقات کے بعد ہاتھ میں لیتے ہیں۔ پھر تجربہ بتا دیتا ہے۔ کہ جس چیز کو ہم ذہن میں رکھ کر چلے تھے۔ وہ صحیح نکلی یا نہیں۔ جب ہم پیغمبر کو اصولی

تحقیقات کے بعد قبول کرتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اب اس کی تعلیم کا عملی تجربہ سے امتحان کریں۔ اور اسی کا نام پیروی ہے سال اگر پیروی میں امکان بھر کوشش کے بعد ہماری روحانی بیماریاں درست نہ ہوں تو اس وقت بیشک کہہ سکتے ہیں کہ معالج کامیاب نہیں رہا۔

وحدت رسل چونکہ رسول خدا کا مظہر یا قائم مقام ہوتا ہے اور خدا صرف ایک ہے اس لئے تمام رسول۔ رشی منی اور اوتار لازماً ایک ہیں۔ جناب کرشن فرماتے ہیں۔

یدا یدا ھی دھرم سے گلا نیر بھوتی بھارت
ابھیت تھانم ادھرم سے تد آتمانم سرجا می ھم

علامہ فیضی نے اس کا ترجمہ کیا ہے:-

چو بنیادِ دیں سست گردد بسے۔ نمایم خود را بشکل کسے

کہ جب دین کی بنیاد یعنی اس کے اصول کمزور ہو جاتے ہیں۔ تو انہیں مضبوط کرنے کے لئے ہم اپنے آپ کو کسی شکل میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ ایک ہی حقیقت کبھی ایک شکل میں اور ایک نام سے اور کبھی دوسری شکل میں اور دوسرے نام سے ظاہر ہوتی ہے۔ جس نے اصل حقیقت کو پہچان لیا ہوتا ہے۔ وہ اس حقیقت کے سامنے جہاں کہیں اور جس نام اور شکل سے وہ ظاہر ہو سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اور دور ہی سے پکار اٹھتا ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش۔ من انداز قدت را می شناسم

لیکن جن نادان نے حقیقت کو نہیں بلکہ ظاہری شکل اور نام کو

اختیار کیا ہوتا ہے جب وہ حقیقت جس کو وہ ایک لباس میں اپنا پیغمبر، رشی منی مانتا ہے دوسری قمیص میں ظاہر ہوتی ہے تو اسے پیٹتا ہے۔ مثلاً اگر اہلِ ہنود کو جناب کرشن کے اس فرمودہ پر یقین ہے۔ کہ جناب کرشن خود ہی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ تو انہیں سوچنا چاہیئے کہ جناب کرشن کے بعد مربیانِ عالم کے انکار اور مخالفت میں وہ کہیں خود جناب کرشن ہی کا انکار اور انہی کی مخالفت تو نہیں کر رہے۔ یہی صورت باقی قوموں اور اہلِ مذاہب کی ہے۔ بعد میں آنے والے پیغمبر کے جامہ میں وہی پہلا پیغمبر پنہاں ہوتا ہے۔ لیکن ہر قوم اس نئے لباس میں اپنے ہی پیغمبر اور رہنما کا انکار کر جاتی ہے۔

جب حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت رامچندر، حضرت کرشن، حضرت زرتشت، حضرت محمد علیہم السلام سب ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ ان میں نہ کوئی بڑا ہے اور نہ چھوٹا۔ جو ان میں کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا جانتا ہے وہ گویا یہ مانتا ہے کہ خدا کبھی بڑا ہوتا ہے اور کبھی چھوٹا۔ اگر سب انبیاء علیہم السلام ایک ہی خدا کے مظاہر ہیں جو نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے تو یہ کوئی صرف کہنے کی ہی بات نہیں بلکہ ٹھوس حقیقت ہے کہ سب پیغمبر ایک جیسے ہیں۔ ان میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ انسان میں ایک خاصہ ہے۔ کہ وہ اپنی بڑائی سے خوش ہوتا ہے۔ یہ خاصہ انسان میں رکھا تو اس لئے گیا تھا کہ وہ خوشی کی خاطر ایسے کام کرے جو واقعی بڑائی کے کام ہیں۔ لیکن جب ہم نے اس راہ سے سچی خوشی حاصل

کرنا نہ چاہا تو ہم نے یوں جھوٹی خوشی حاصل کرنا شروع کیا۔ کہ ہمارا باپ سب سے بڑا تھا۔ اس واسطے ہم سب سے بڑے ہیں۔ منہ سے تو کہا کہ ہمارا باپ سب سے بڑا تھا لیکن یہ نہ جانا کہ سب کا باپ ایک ہی ہے اور خواہ کسی نام سے اسکی تحقیر ہو وہ اپنے ہی باپ کی تحقیر ہے۔ اگر میں اپنے سگے بھائی کے باپ کی تحقیر کروں تو کیا میں اپنے باپ کی تحقیر نہیں کر رہا؟ پس سب پیغمبروں کی حقیقت جب ایک ہے کسی پیغمبر کی تحقیر سب کی تحقیر ہے اور کسی پیغمبر کا انکار سب کا انکار ہے۔

سوال ہوتا ہے کہ جب یہ صورت ہے تو پھر بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت ہونے کے کیا معنی ہیں؟ سو واضح ہو کہ اس فضیلت کا مطلب یہ ہے کہ بعض پیغمبروں کو کام کرنے کے ایک قسم کے موقعے ملے۔ اور بعض کو دوسری قسم کے۔ مثلاً ایک استاد کو مدرسہ میں آٹھویں جماعت میں کام کرنے کا موقعہ ملا اور دوسرے کو دسویں میں۔ ایک کو بہت ہی غبی اور کند ذہن طالب علم ملے۔ دوسرے کو اس سے بہتر۔ ایک کی جماعت چھوٹی ہوئی۔ دوسرے کی بڑی۔ ایک کی جماعت میں کچھ اچھے طالب علم نکل آئے، جو خود سیکھ کر دوسرے ہم جماعتوں کو سکھانے میں استاد کی امداد بھی کرنے لگ گئے۔ دوسرے کو ایسی امداد میسر نہ آئی۔ اگر ایک ہی استاد ان مختلف حالات میں کام کرے تو بھی نتیجے مختلف ہوں گے۔ کہیں اس کی کارکردگی اور کامیابی زیادہ دکھائی دے گی اور کہیں کم۔ یہی حال پیغمبروں کا ہے۔

پیغمبروں کی کارکردگیوں اور کامیابیوں میں جو فرق دکھائی دیتا ہے۔ وہ اس وجہ سے نہیں۔ کہ کوئی پیغمبر زیادہ لائق استاد تھا

اور کوئی کم۔ بلکہ فرق ان حالات کی وجہ سے ہے جن میں انہیں کام کرنا پڑا اپنی ذات میں ہر پیغمبر اتنا ہی لائق استاد تھا جتنا کہ دوسرا جب سب ایک ہی خدا کے مظاہر ہیں تو لازماً ان کو یکساں لیاقت کا ہونا چاہیئے۔ ہاں کسی کی لیاقت کا ظہور ایک پیمانہ پر ہوا اور کسی کا دوسرے پیمانہ پر۔ کسی کا ایک راہ سے اور کسی کا دوسری راہ سے۔ غرض اس فرق کی وجہ طالب علموں کی استعدادوں اور حالات کا اختلاف تھا۔

خُلق عفو کا ظہور چاہتا ہے کہ پہلے انسان کو مغلوب و مظلوم رہنے اور بعد میں غالب ہونے کے موقعے ملیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوسری قسم کا موقعہ نہیں ملا۔ تو کیا آپ میں یہ خُلق محتاج ثبوت ہے؟ اخلاق جدا جدا نہیں۔ بلکہ سب اپنی جڑ کے ذریعہ جسکی وہ شاخیں ہیں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اخلاق کی جڑ ہے تہذیب نفس جسے اپنے نفس پر قابو حاصل ہو گیا۔ اس سے ہر حال میں اخلاقی طاقت کا ظہور ہوتا رہیگا جس میں جسمانی طاقت ہے اسے رسا کھینچنا پڑے تو کھینچ لے گا۔ بوجھ اٹھانا پڑے تو اٹھا لے گا۔ سفر کی کلفتیں سہنا پڑیں تو سہہ لے گا کشتی لڑنا پڑے تو لڑ لے گا۔ غرض جو صورت پیش آئے وہ قوت جو اسے حاصل ہو چکی ہے ظاہر ہوتی رہے گی۔ ٹھیک اسی طرح جس کو ضبط نفس کی قوت حاصل ہے اس کا نفس کبھی بے قابو نہیں ہوگا۔

جو مظلومی کی حالت میں تربیت عام کی خاطر نفس کے آرام و آسایش کے مطالبہ کو ٹھکرا سکتا ہے وہ غلبہ کی حالت میں نفس

کے جذبۂ انتقام کو بھی یقیناً ٹھکرا سکتا ہے۔ اگر اسے نفس پر ضبط حاصل نہ ہوا ہوتا۔ تو وہ مظلومی کے وقت ظلم نہ سہ سکنے کے باعث ظلم کے سامنے ہتھیار رکھ دیتا۔ جس طرح اس نے دوسروں کے غلبہ کی طاقت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے اسی طرح وہ اپنے غلبہ کی طاقت کے سامنے بھی ہتھیار نہیں ڈال سکتا۔ حضرت محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ انسان کے پہلو میں ایک چھوٹا سا گوشت کا ٹکڑا ہے یعنی دل۔ اگر وہ سدھر گیا۔ تو سارا جسم سدھر گیا۔ سو پیغمبر بے حد مظلومی کی حالت میں خدا کی رضا کو ہاتھ سے نہ دے کر اس بات کا بھی ثبوت بہم پہنچا دیتا ہے کہ غلبہ کی حالت میں بھی وہ خدا کی رضا کے خلاف عمل نہیں کر سکتا۔

رسول ارادۂ اللہ کا نمونہ دیتا ہے۔ یعنی خدا کے ارادہ (مرضی) کو خدا کی سی قوت ارادی کے ساتھ سامنے رکھتا ہے۔ اور کوئی طاقت اس کو خدا کے ارادہ (مرضی) سے الگ نہیں کر سکتی۔ اور یہ ایسا نمونہ ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں اخلاق فاضلہ کے نمونوں کی جڑ ہے۔ سب نمونے اس کے اندر آجاتے ہیں۔ اس واسطے پیغمبروں کی زندگیوں میں انسانی زندگی کے شعبوں اور اخلاق کے فرداً فرداً نمونوں کو تلاش کرنا اور ان کی کثرت و قلت کی بناء پر رسولوں میں چھوٹائی بڑائی کی تمیز کرنا صحیح نہیں۔

جناب کرشن علیہ السلام کے مذکورہ فرمان سے یہ بات تو واضح ہو چکی کہ پیغمبر اس وقت آتا ہے جب دین کی بنیاد کمزور ہو چکتی ہے۔ اور وہ وہی ہوتا ہے جو پہلے آیا تھا۔ صرف شکل اور ہوتی

ہے پس پیغمبر وقت کے وجود میں تمام سابقہ پیغمبر جمع ہوتے ہیں اور اس کا انکار سب کا انکار ہے۔ پیغمبر وقت کا انکار کر کے کسی کو حق نہیں رہتا کہ وہ کسی سابقہ پیغمبر کو ماننے کا دعوے کرے۔ کیونکہ وہ اس سابقہ پیغمبر کا نئے لباس میں انکار کر چکا ہے۔ اور سابقہ پیغمبر کی اس ہدایت کو کہ جب وہ دوسرے لباس میں آئے گا تو اسے ماننا ٹھکرا چکا ہے۔ اب اگر وہ مانتا ہے تو اپنی نفسانیت کے بت کو مانتا ہے نہ کہ پیغمبر کو۔

سو اس حقیقت واحدہ کا جو سب پیغمبروں میں ظاہر ہوتی ہے۔ انکار کر کے الگ الگ پیغمبروں کے ناموں کو ماننے رہنا بت پرستی ہے۔ اور ساری مذہبی لڑائیاں اور تفریق اس بت پرستی کا نتیجہ ہیں۔ حاصل کلام تمام پیغمبروں کی یکساں عزت کرنا اور پیغمبر وقت کی اطاعت کرنا توحید ہے اور باقی شرک۔ توحید علت اتحاد ہے اور شرک موجب فساد۔

وحدت ادیان

چونکہ سب رشی منی اوتار ایک ہیں وہ ایک دوسرے کے خلاف تعلیم نہیں دے سکتے سب کا مقصد ایک ہے یعنی تربیت انسان۔ اور سب کی بنیادی تعلیم بھی ایک ہی ہے پیغمبروں کی تعلیم کا بنیادی اصول توحید ہے۔ ایک پہلو توحید کا وحدت رسل کے مضمون میں بیان ہو چکا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر انسان میں خدا کی تجلی کا اقرار کیا جائے۔ اور ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ بے بدل مانا جائے۔ اور بالعمل ہر فرد کی زندگی اور اس کے حقوق کا اتنا ہی احترام کیا جائے

جتنا اپنی زندگی اور اپنے حقوق کا انسان کرتا ہے۔ تیسرا پہلو توحید کا یہ ہے کہ اپنی زندگی کا مقصود و مطلوب خدا کو مانا جائے انسان ہر چیز کو یہاں تک کہ اپنی زندگی اور اس سے بڑھ کر اپنی عزت کو بھی چھوڑ سکے لیکن اپنے آقا اور اپنے محبوب کو نہ چھوڑ سکے۔ پہلے دو پہلوؤں کا مقصد یہ ہے کہ نوع انسان ایک خدا کو مان کر خود ایک ہو جائے۔ اور تیسرے پہلو کا مدعا انسان میں ایسی قوت پیدا کرنا ہے کہ نفع کے لالچ اور نقصان کے خوف سے اس کا قدم سیدھی راہ سے پھسلنے نہ پائے۔ اور وہ دنیا جہان کی موافق و مخالف طاقتوں سے بے نیاز ہو کر ساری نسل انسانی کے مشترکہ مفاد کے لئے کام کرتا رہے۔ پیغمبروں کی تعلیموں میں جو فرق ہے وہ اصول کا نہیں بلکہ اصول کی تشکیل کا ہے جو ہر زمانہ میں حالات زمانہ کے مناسب کرنا پڑی۔ مقصد کے اتحاد اور شکلوں کے اختلاف کی ایسی مثال ہے جیسے مثلاً ا مقام سے ب مقام تک پہنچنے کے لئے ایک زمانہ میں تانگہ بنایا گیا۔ دوسرے زمانہ میں ریل نکل آئی۔ تیسرے میں ہوائی جہاز یا مثلاً لب بام پر چڑھنے کے لئے بانس کی سیڑھی جس سے انسان مشکل سے چڑھتا ہے وجود میں آئی۔ پھر اینٹ، پتھر کی چوڑی سیڑھیاں جن میں گرنے کا خطرہ نہیں مہیا ہو گئیں۔ پھر بجلی کے "لفٹ" میسر آ گئے جن سے انسان بیٹھے بٹھائے تیزی سے چڑھ جاتا ہے۔ پیغمبر جو ایک دوسرے کے بعد آتے رہے وہ سب متحد المقصد تھے۔ سب کا مقصد خلق کو خالق سے ملانا یا انسانیت کو نشو و نما دینا تھا۔ پر ذرائع جو انہوں نے

تجویز کئے وہ اختلاف حالات کے باعث مختلف تھے۔ سو اُن میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ سطحی ہے۔ تہ میں وہ سب ایک ہیں ہر بعد میں آنے والا مربی عالم اپنے سے پہلے مربیان عالم کے لگائے ہوئے پودوں کا پھل اور ان کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اگر انسان عقل سے کام لے تو اسے اس مُوجد کا جس نے مثلاً ٹانگہ کی بجائے ریل ایجاد کر دی ہے۔ شکر گذار ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس موجد نے اس کام کو آسان کر دیا۔ لیکن چونکہ لوگ ذریعہ کو۔ نہ کہ مقصد کو اصل چیز سمجھ چکے ہوتے ہیں مخالفت پر اتر آتے ہیں کہ ہمارا دین بدل گیا۔ حالانکہ دین کو نہیں بدلا گیا۔ بلکہ دین کے جسم کو جو مرور زمانہ سے بوسیدہ ہو گیا تھا اور نئے حالات میں دین کے کندھوں کا بوجھ تھا اور اسے اپنے کام سے روک رہا تھا۔ بدل کر نیا جسم دیا گیا جس میں وہ پھل پھول سکتا ہے۔ جو شخص ضرورت کے موقعہ پر نئی تشکیل دین کا انکار کرتا ہے اس کے ہاتھ سے دین بالکل نکل جاتا ہے۔ پہلی شکل زمانہ نے ناقابل عمل بنا دی ہوتی ہے اور نئی وہ اختیار نہیں کرتا۔ اس طرح دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

جیسے پیغمبر اصولی تعلیم کی جو مشترکہ ہے تشکیل اپنے زمانہ کے مناسب حال کرتا ہے۔ اسی طرح اس کے بیانات بھی اپنے زمانہ کے لوگوں کے فہم کے اندازے سے ہوتے ہیں۔ تمام پیغمبروں کی تعلیم میں جو اصول کام کر رہا ہے وہ ایک ہی ہے۔ اختلافات صرف تین قسم کے ہیں۔ کہیں شکل کے جو مقامی اور زمانی حالات کی پیداوار ہیں کہیں پیرایۂ بیان کے جو پیغمبر کے مخاطبوں کے مدارج فہم کی وجہ سے

ہیں۔ اور کہیں ان کے بعد میں آنے والے پیروں کی غلط فہمیوں خود غرضیوں۔ باہمی تفرقوں اور آمیزشوں کی وجہ سے۔

ایک دفعہ ایک دوست نے مجھ سے سوال کیا۔ کہ خدا نے ہندوؤں کو اواگون یعنی تناسخ کی تعلیم دی۔ مسلمانوں کو اس کے خلاف اگلے جہان میں بہشت و دوزخ بتایا۔ ان دونوں تعلیموں میں کھلا کھلا اختلاف ہے۔ میں نے عرض کیا کہ "تناسخ اور اسلام کے نقطۂ نظر میں مفصلہ ذیل چیزیں مشترک ہیں۔

۱۔ تناسخ تسلیم کرتا ہے۔ کہ اس زندگی کے بعد زندگی ہے۔ یہ نہیں کہ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جائے۔

۲۔ اس زندگی کے بعد جو زندگی ہے۔ وہ اس زندگی کے کرموں (اعمال) کے عین مطابق ہے۔ جو یہاں بوؤ گے وہی وہاں کاٹو گے

(۳) تناسخ کا مقصد انسان میں اپنے اعمال کی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا ہے۔ کہ انسان ہر عمل سے پہلے سوچ لے کہ جو کچھ میں کرنے لگا ہوں میرے گلے کا ہار ہو جائے گا۔ یہ ایسی چیز نہیں جو بے نتیجہ ہو اور جس کا نتیجہ خود مجھے بھگتنا نہ پڑے۔ انصاف سے بتایئے کہ اگر ایک قائل تناسخ اپنے عقیدہ میں مخلص ہو۔ تو کیا یہ عقیدہ اس کی زندگی کو تمام بدیوں سے پاک نہیں کر دیتا؟

ٹھیک اسی طرح اسلام بھی تسلیم کرتا ہے۔ کہ

(۱) اس زندگی کے بعد اور زندگی ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔

۲- یہ زندگی کھیتی ہے۔ اور دوسری زندگی میں اس کھیتی کا خرمن اٹھانا ہے۔ جو یہاں بوؤ گے۔ وہی وہاں کاٹو گے۔
۳- مقصد یہ ہے کہ۔ انسان میں عمل کی ذمہ داری کا احساس ہو۔ قرآن میں سے کہ ہم نے ہر شخص[ا] کے عمل کو اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے۔ اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔ جو ذرہ[ب] کے برابر نیکی کرے گا اسے بھی بھوگے گا اور جو ذرہ کے برابر بدی کرے گا اسے بھی بھوگے گا۔ اگر مسلمان کو اس بات پر واقعی ایمان ہو تو اس کی زندگی بھی پاک ہو جائے گی۔

باقی رہی آخری زندگی کی نوعیت اور تفصیل۔ اس کے متعلق نہ مسلمانوں کو یہ دعوے کرنا چاہیئے کہ وہ کیا ہے۔ نہ ہندوؤں کو۔ ہر چیز کی اپنے وقت پر سمجھ آتی ہے۔ جیسے ایک نابالغ بچہ میاں بیوی کے تعلقات کو سمجھ نہیں سکتا اسی طرح انسان موت کے بعد کے حالات کی تفصیل کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لیے قرآن میں ہے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ جو نیک عمل وہ کرتا ہے اس کے بدلہ میں کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک اسے نصیب ہوگی۔ حدیث میں ہے کہ بہشت اور دنیا کی نعمتوں میں صرف نام کا اشتراک ہے ورنہ وہ نعمتیں نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنی ہیں نہ کسی کے دل و دماغ میں کبھی ان کا تصور آیا ہے۔ ہاں آیت مذکورہ میں انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک سے

[ا] وکل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہ
[ب] فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ

تعبیر کیا ہے۔ اور دوسری جگہ فرمایا یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔ کہ اے وہ نفس جو شانت ہو گیا ہے۔ اپنے رب کے حضور ایسی حالت میں لوٹ آ کہ تو اس سے رضی اور وہ تجھ سے رضی میرے بندوں میں داخل ہو۔ اور میری بہشت میں داخل ہو جا یہاں اطمینان یعنی شانتی کا نام جنت رکھا ہے۔ اور شانتی کی شناخت یہ بتائی ہے کہ ہر حال میں تو خدا سے راضی رہے۔ خدا کے تجھ سے رضی ہونے کی پرکھ یہی ہے کہ تو کسی حالت میں بھی اپنے دل کے کسی گوشہ میں خدا سے کدورت اور گلہ نہ پائے۔ اگر تو اس سے ہر حال میں پورے طور پر رضی ہے تو جان لے کہ وہ بھی تجھ سے رضی ہے۔ اس آیت میں صاف طور پر رضی برضائے الٰہی ہونے کو جس سے اطمینان اور شانتی حاصل ہوتی ہے جنت قرار دیا ہے۔

غرض اس زندگی کی تفصیل نہ یہاں انسان کی سمجھ میں آسکتی تھی/ نہ بتانے کی ضرورت تھی/ جتنا ضروری تھا اتنا بتا دیا گیا کہ ہوشیار رہنا اس زندگی کے بعد اور زندگی ہے۔ جیسا یہاں کرو گے ویسا وہاں بھرو گے۔ یہ بونے کا موقع ہے۔ وہ کاٹنے کا۔ اگر بونے کے موقعہ میں اس جھگڑے میں لگے رہے کہ پھل کی نوعیت کیا ہوگی؟ اندھا لنگڑا یا تندرست توانا ہوکر اسی دنیا میں لوٹ کر آنا ہے یا بہشت و دوزخ میں جانا ہے تو جب بویا ہی کچھ نہیں کاٹنا خاک ہے۔

ناظرین کرام نے دیکھا ہوگا کہ دونوں تعلیموں کا مقصد اور اس کے ضروری اجزاء ایک ہیں۔ اور نتیجہ بھی ایک ہے کہ اچھے کاموں سے دوسری زندگی میں سکھ ہوگا اور برے کاموں سے دکھ۔ اس دکھ سکھ کی تفصیل کے بارہ میں اختلاف ہے جو قبل از وقت اور غیر ضروری ہے۔ اور دونوں تعلیموں کے مشترکہ اجزاء اور مقصد کی طرف دھیان نہ دینے کا نتیجہ ہے اور باہمی کشیدگی کے لئے بہانہ۔

۷۔ تزکیہ

تزکیہ کے معنی ہیں پاک کرنا اور نشو ونما دینا۔ اور دونوں اصل میں ایک ہیں جب تک زندگی کو ان جراثیم اور ان بیماریوں سے جو اسے نشو ونما پانے سے روک رہی ہیں پاک نہ کیا جائے نشو ونما کا راستہ نہیں کھلتا۔ تندرست جسم نشو ونما پاتا ہے۔ اور بیمار کی ترقی رک جاتی ہے۔ پس تزکیہ کے معنی ان روکوں کو جو ترقی میں حائل ہیں دور کرکے ترقی کے قابل بنا دینا ہے۔

پیغمبر اس وقت ظاہر ہوتا ہے۔ جب سابقہ پیغمبر کی تعلیم کی روح عالم سے رخصت ہو چکی ہوتی ہے۔ اور مذہب بے جان رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہوتا ہے۔ اس صورت حال کی زیادہ تر دو وجہیں ہوتی ہیں (۱) اصول دین کی جو تشکیل سابقہ پیغمبر نے

کی تھی اور تفصیلات بنائی تھیں ان پر لمبا زمانہ گذر چکنے اور اس دوران میں حالات بدل چکنے کے باعث اب وہ قابل عمل نہیں رہی ہوتیں۔ دوسرے پیغمبر کے نام لیوا لمبا زمانہ گذر جانے کے باعث دین کی حقیقت کو فراموش کر کے صرف لفظوں پر آ رہے ہوتے ہیں۔ اور پھر لفظوں کو اپنی خودغرضیوں کا آلہ بنا کر بے حد متفرق ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان حالات میں تعلیم کے بیشتر حصہ کا صحیح مفہوم ہی معلوم کرنا مشکل ہو چکتا ہے۔ اور جس حصہ کا مفہوم پیغمبر کی سنت یا اس کے جلد بعد کے زمانہ کی "تاریخی روشنی" میں معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے حالات سازگار نہیں رہے ہوتے۔ نہ اصول دین کو سمجھ سکتے ہیں۔ نہ اس کی پرانی شکل پر قائم رہ سکتے ہیں۔ نہ نئی تشکیل کی ہمت و اہلیت رکھتے ہیں۔ نہ سابقہ تشکیل میں کسی ترمیم کو جائز سمجھتے ہیں۔ خیالات فرسودہ ہو چکے ہوتے ہیں ہمتیں پست۔ نہ کوئی مقصد سامنے ہوتا ہے۔ نہ حصول مقصد کا رستہ۔ مذہبی طبقہ کے باہمی فتنہ و فساد اور بیکاری سے تنگ آ کر فہمیدہ لوگوں کی دلچسپیاں مذہب سے شعوری یا غیر شعوری طور پر کم ہوتی جاتی ہیں۔ اور جو لوگ مذہبی رسوم کے پابند ہوتے ہیں ان کے ہاتھ میں بھی صرف چھلکا ہی ہوتا ہے۔ یہ تمام بیماریاں عالم کے کندھوں کا بوجھ اور اس کے پاؤں کی زنجیریں ہوتی ہیں۔ جو اسے ترقی کرنے نہیں دیتیں۔

پیغمبر اصول دین کی نئی تشکیل حسب حالات زمانہ کرتا ہے دین کی حقیقت کو بیان کرتا اور سمجھاتا ہے۔ لوگوں کو ان کے پرانے وہموں فرسودہ خیالوں۔ بے جان رسموں اور تفرقوں سے پاک کر کے ان کے سامنے واضح اور مفید عام مقصد رکھ دیتا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے کام پر لگا دیتا ہے۔ عالم کو ان بیماریوں سے جو اس کی ترقی میں روک تھیں پاک کر کے اس میں نئی زندگی کی روح پھونکنے اور اسے شاہراہ ترقی پر دوبارہ ڈال دینے کی وجہ سے پیغمبر مزکی عالم کہلاتا ہے۔ اور تزکیہ کے یہی معنی ہیں۔

روحانیت:۔ جس نے کثرت کے پیچھے اس کی روح کو جو وحدت ہے پا لیا وہ روحانی انسان ہے۔ اور جو کثرت کے دھوکے میں پھنسا رہا وہ جسمانی۔ جس نے افراد انسانی کو ان کی مشترکہ روح (انسانیت) کی حیثیت سے دیکھا اور سب کو ایک سمجھا وہ روحانی ہے۔ اور جو متعدد جسموں کی بناء پر ان کی کثرت اور تفرقہ کا قائل ہوا۔ وہ مادہ پرست ہے۔ جس کو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔

منشاء الٰہی

خدا نے انسان کو بہشت میں رہنے کے لئے بنایا ہے

"یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ"

یعنی اس کے اندر ایسے قواء رکھے ہیں اور باہر زمین و آسمان میں ایسا سامان ہے کہ اگر انسان اپنے قواء کو تسخیر عالم پر لگائے تو اس کی علمی و عملی متحدہ سرگرمیوں سے اس کے تمام دکھوں اور دردوں کا خاتمہ ہو جائے اور زمین آرام و آسائش کے سامانوں سے بھر کر بہشت بن جائے لیکن شیطان اسے اس کی فطرت سے پھسلا کر جنت سے نکال دیتا ہے۔ سب انسان فطرتاً ایک ہیں۔ اور ضروریات زندگی کے یکساں محتاج اور حقدار ہیں۔ شیطان انسان کو وحدت انسانی سے پھسلا کر انفرادی انسانیت کا قائل بنا دیتا ہے اور ہر فرد اپنے آپ کو دوسرے افراد سے الگ سمجھنے لگتا ہے۔ پھر خود کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے اور اس کے انسانی حقوق کا انکار کرتا ہے۔ اس کا نام قرآن نے فطرت سے گراوٹ رکھا ہے اور بتایا ہے کہ آپس کی دشمنی اسی گراوٹ کا نتیجہ ہے۔ اس عداوت کے علاج کے لئے خدا نے پیغمبروں کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن جس طرح قدم اول پر شیطان نے انسان کو اس کی اندرونی خاموش فطرت سے پھسلایا تھا۔ اس موقعہ پر پھر وہ اسے پیغمبر سے جو ترجمانِ فطرت یا ناطق فطرت ہے پھسلا دیتا ہے۔ فطرت میں اور شیطان میں جنگ ہوتی ہے۔ ہر پیغمبر کا زمانہ قیامت

لہ یہی تکبر اور انکار کا درخت ہے جس کا پھل شیطان نے خود بھی کھایا اور آدم کو بھی کھلایا + ۲

ہوتا ہے۔ عرفِ عام میں جسے قیامت کہتے ہیں۔ قرآن اس کے دو پہلو بیان کرتا ہے۔ ساعتہ اور قیامتہ۔ خودغرضی پر مبنی سابقہ نظام کی تباہی کی گھڑی ساعتہ ہے۔ اور انسانیت عامہ کے مفید جدید نظام کا قیام قیامت ہے قرآن اس کو خلق جدید بھی کہتا ہے۔ قیامت میں جو فنائے عالم اور فنا کے بعد دوبارہ عالم کی پیدائش مانی جاتی ہے اس سے مراد بھی سابقہ حیوانی نظام کی فنا اور اس کی بجائے نظام جدید یا خلق جدید کا وجود میں آنا ہے۔ قیامت میں مُردوں کے جی اٹھنے سے بھی خلق جدید ہی مراد ہے جس میں انسانیت جو جہالت کے نیچے دبی ہوئی تھی جیسے مُردہ زمین میں دبا ہوتا ہے بیدار ہو جاتی ہے۔ اور انسان جو اس وقت تک برائے نام انسان تھا اور واقعہ میں انسانیت سے گر کر حیوان بن چکا تھا انسانیت میں نیا جنم لیتا ہے۔

جب پیغمبر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ دنیا کو حیوانی خواہشات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتا ہے سوائے چند لوگوں کے جن میں حق شناسی کی استعداد موجود ہوتی ہے اور جو اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ان چند کے مقابلہ میں بے پناہ اکثریت ہوتی ہے جو حق کو سر نکالتے ہی کچل دینے کی ٹھان لیتی ہے۔ یہ مخالف صرف خدا کے منکر اور دہریہ ہی نہیں ہوتے بلکہ ان کا بیشتر حصہ دین کے رہنماؤں اور قائدوں کا ہوتا ہے۔ جو اس آگ کو مذہب اور خدا کے نام پر بھڑکاتے

ہیں۔ مصلح کو اپنے آبائی مذہب اور قومی روایات کے لئے بہت
بڑا خطرہ قرار دیتے ہیں اور اس کے انکار اور مخالفت میں اپنی بقا
اور اس کے پیچھے لگنے میں اپنی موت خیال کرتے ہیں۔ غرض بے دینی
دین کا روپ دھار کر پیغمبر کے مقابلہ پر آتی ہے۔ رفتہ رفتہ کچھ لوگ
ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جنہیں یہ تو دکھائی دیتا ہے کہ پیغمبر کی تعلیم
مفید ہے لیکن اس کی تعلیم کو قبول کرنے میں عام مخالفت کی وجہ سے
جو مشکلات ہوتی ہیں ان کو برداشت کرنے کا انہیں حوصلہ نہیں
ہوتا۔ اس واسطے جب تک پیغمبر کی مخالفت کے قاید تباہ نہیں ہو
جاتے اور حق کو قبول کرنے والوں پر ظلم کا خاتمہ نہیں ہو جاتا
پیغمبر کا پیغام عام قبولیت حاصل نہیں کرتا۔ اور "یدخلون
فی دین اللہ افواجا" کا نظارہ دکھائی نہیں دیتا۔ مخالفت
کی اس تباہی کی گھڑی کو ساعت کہتے ہیں۔ اور اس کے بعد
جو عام قبولیت حق ہوتی ہے۔ اس کو قیامت یعنی حق پر قایم
ہونے یا روحانی مردوں کے جی اٹھنے کا وقت۔ پیغمبر کو اپنے
ظہور کے روز اول سے ہی یقین ہوتا ہے۔ کہ انجام کار اس کی
مخالفت ناکام رہے گی۔ اور وہ حق کو قایم کرنے میں کامیاب
ہو جائے گا۔ اور یہ اہم خبر یا نباء عظیم وہ دوست دشمن دونوں
کو دیتا رہتا ہے۔ دوستوں کو بشارت کے طور پر اور دشمنوں
کو انذار کے طور پر۔ اور آخر کار ایسا ہی ہوتا ہے۔ پیغمبر ایک
قوم کو حق پر قایم کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور مخالفین
اپنی ایڑی چوٹی کی کوششوں کے باوجود پیغمبر کی تحریک کو

کھلنے ہیں ناکام رہتے ہیں جیسے افراد پیدا ہوتے ہیں بڑھتے ہیں۔ جوان ہوتے ہیں جوانی سے ڈھلتے بوڑھے ہوتے اور آخرکار مر جاتے ہیں۔ ویسے ہی قوموں کی حالت ہے۔ قومیں بنتی ہیں ترقی کرتی ہیں۔ معراج کمال کو پہنچتی ہیں۔ پھر گرتی ہیں بگڑتی ہیں۔ اور مٹ جاتی ہیں۔ نئی قوم جو پیغمبر کے ہاتھ پر زندہ ہوتی ہے ترقی کرتی ہے پھلتی پھولتی ہے۔ تربیت و ترقی عالم کا موجب بنتی ہے۔ آخر تدریجاً اس راہ سے جس پر پیغمبر نے اُسے ڈالا تھا۔ بھٹک کر کمزور ہوتی ہے اور بیمار کی طرح موت کے قریب پہنچتی جاتی ہے۔ اس وقت پھر ایک اور پیغمبر ظاہر ہوتا ہے پھر وہی سابقہ عمل دہرایا جاتا ہے۔ ہر پیغمبر جو آتا ہے اس کے زمانہ میں اس کے مقصد کی جزئی تکمیل ہوتی ہے۔ یعنی پیغمبر کا مقصد تو یہ ہوتا ہے۔ کہ ساری کی ساری نوع انسان حق پر قائم ہو جائے۔ اور ہمیشہ کے لئے ہو جائے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ نوع انسان کا بہت چھوٹا سا حصہ اس کی دعوت قبول کرتا ہے اور وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد بگڑ جاتا ہے۔ اگرچہ وہ لوگ بھی جو پیغمبر پر ایمان نہیں لاتے اس کی تعلیم سے مستفیض ہوتے ہیں۔ اور اس طور سے عالم کی عمومی ترقی ہوتی رہتی ہے لیکن پیغمبر کے مقصد کے لحاظ سے جو کام پیغمبر کے زمانہ میں ہوتا ہے۔ وہ پیغمبر کی منزل مقصود کی طرف جو عالمگیر روحانی انقلاب ہے۔ ایک قدم ہوتا ہے۔ تمام پیغمبروں نے آئندہ زمانہ میں ایک عالمگیر روحانی بیداری کی خبر دی ہے جس وقت شیر بکری ایک گھاٹ پانی پئیں گے

دنیا عدل و انصاف و محبت و اخوت سے بھر جائے گی یہ ست جگ کا زمانہ ہوگا۔ اور خدا کی مرضی جیسے آسمان پر پوری ہو رہی ہے زمین پر پوری ہوگی۔ ہر پیغمبر کے وقت میں فطرت غالب آتی ہے۔ اور مخالفت مغلوب ہو جاتی ہے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد انسان فطرت سے جس پر پیغمبر قائم کر گیا تھا گر جاتا ہے۔ اور وحدت و اخوت کی جگہ باہمی عداوت و تفرقہ لے لیتے ہیں۔ لیکن فطرت سے ہبوط (گراوٹ) ہمیشہ کے لئے نہیں کیونکہ ہر بار کے ابھار اور گراوٹ میں عالم کچھ نہ کچھ خالص بلندی حاصل کر جاتا ہے جسے وہ کھوتا نہیں۔ آخرکار انسان نے گراوٹ سے جو باہمی بغض و عداوت کا نام ہے باہر نکل آنا ہے۔ فطرت سے گراوٹ یا بگاڑ صرف ایک مقررہ وقت تک ہے۔ جب وہ مقررہ وقت آ پہنچتا ہے یہ بگاڑ اپنے ہاتھوں خودکشی کر لے گا یہ اپنی پیدا کردہ نفرت و عداوت کا خود شکار ہو جائے گا۔ اس وقت فساد و خونریزی اپنی حد کو پہنچ جائے گی۔ اور انسان کا فساد و خونریزی کا شوق تمام ہو جائے گا۔ وہ اس سے تنگ آجائے گا۔ اور مجبور ہو کر فطرت کی طرف لوٹے گا۔ اور وحدت انسانی کو پالے گا۔ انقلاب عالمگیر ہوگا۔ تمام نوع انسان متحد ہو کر ایک کنبہ کی طرح رہنے لگے گی۔ اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اس وقت [illegible] پورا ہوگا اور خدا کا حکم "یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ"

پورا ہو جائے گا۔ اس وقت زمین کا چپہ چپہ زبان حال سے توحید باری کی گواہی دیتا ہوگا۔ اور تمام انبیاء کی محنتیں جو وہ توحید و اتحاد انسان کے لئے کرتے رہے ہیں۔ ٹھکانے لگیں گی اور حق کی کامیابی کی اہم خبر (منبأ عظیم) جو انہوں نے دی تھی۔ اور ان کے اپنے اپنے زمانہ میں جزئی طور پر پوری ہوئی تھی اس زمانہ میں آخری اور کلی طور پر پوری ہو جائے گی۔ اس لئے اگر ان کے اپنے اپنے زمانے حیوانی نظام کی جزئی تباہی کے باعث ساعت تھے۔ تو وہ زمانہ شیطانی نظام کے فناء کلی کے باعث ساعت عظمیٰ (بڑی ساعۃ) ہوگا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے زمانے اگر روحانی احیاء کی جزئی تکمیل کے سبب قیامت تھے تو وہ زمانہ تمام روحانی مردوں کے جی اٹھنے کے باعث قیامت کبریٰ ہوگا۔ جو چیز تفرقہ کو ہمیشہ کے لئے فناء کر دیگی وہ جہنم ہے۔ اور اس کے نتیجہ کے طور پر جو اتحاد عالم وجود میں آئے گا۔ وہ جنت ہے۔

اگر بالآخر زمین پر جنت قائم نہ ہوئی اور انسان اسی طرح فساد و خونریزی کرتا رہا ہے اور کرۂ ارض فناء ہو گیا تو کچھ شک نہیں کہ پیغمبروں کے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلا صرف مزید تفرقہ ہی ہوتا رہا اور ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں جنگ ہوتی رہی اس طرح فرشتوں کا یہ کہنا کہ خلیفہ موجب فساد و خونریزی ہوگا سچ نکلا اور پیغمبروں کی کامیابی جس کی طرف خدا نے ان الفاظ میں اشارہ کیا کہ تمہاری نظر ظاہری اور

ہنگامی تفرقہ و فساد پر ہے لیکن مجھے وہ بھی دکھائی دیتا ہے
جو تمہیں نظر نہیں آ رہا۔ ظہور میں نہ آئی خدا کی سکیم ناکام رہی
اور اس کا کلمہ " یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ"
کہ اے نوع انسان جنّت میں رہو۔ پورا نہ ہوا۔ اس صورت
میں خدا کا تمام کائنات کو فناء کرنا اور پھر پہلے پچھلے سرکشوں
کو اکٹھا کر کے ابد الآباد کے لئے جہنّم میں ڈال دینا گویا اپنے
کئے پر افسوس کرنا اور اپنی ناکامی کا ماتم کرنا ہے۔ جو حاشا
وکلا خدا کی شان کے شایاں نہیں۔
پس کچھ شک نہیں کہ اس زمین کو جنّت بننا ہے۔ اور نوع
انسان کو متحد ہوکر ایک کنبہ کی طرح ہر دکھ اور درد سے آزاد
ہوکر اس جنت میں رہنا ہے اور عجب نہیں بلکہ اغلب ہے کہ یہ
جنگیں جو ہمارے سامنے ہو رہی ہیں اور جن کو ہر کس و ناکس
جہنم کہہ رہا ہے۔ یہی وہ جہنم ہو جس سے انسان نے وحدت انسانی
کا سبق لے کر نکلنا اور متحد ہو کر زمین کو جنّت بنا کر اس میں
رہنا ہے۔ ممکن ہے حال کی جنگ کے بعد اور جنگیں ہوں۔ یا اور
آفات آئیں۔ کیونکہ جہنم کا زمانہ کافی لمبا زمانہ ہے۔ تمام
آسمانی کتابوں نے آخری زمانہ میں دنیا کے فناء ہوکر دوبارہ
بننے کی جو علامات لکھی ہیں۔ وہ سب اس زمانہ میں پوری ہو
رہی ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف کی رُو سے یاجوج و ماجوج
کے کھلنے کا زمانہ وہ زمانہ ہے جس میں ان کی آویزش سے
جہنم برپا ہوگا۔ فساد کرنے والے مٹ جائیں گے اور دنیا متحد

ہو جائے گی۔ گویا ہم قیامت کبریٰ کے دور اوّل میں جس میں پرانی دنیا (نظام کہنہ) فنا ہو رہی ہے گذر رہے ہیں۔ اور جنت جو اس کے بعد کرۂ ارض پر قائم ہونے والی ہے اس کے دروازے پر کھڑے ہیں۔

نہ صرف خدا کی الہامی کتابوں کی رو سے خدا کی یہ سکیم معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ سائنس دان اپنی علیحدہ تحقیقات سے بھی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کرۂ ارض پر ایک مافوق الانسان نسل آ رہی ہے۔ خدا کی فعلی شہادت جو واقعات کے رنگ میں سب سے بڑی شہادت ہے۔ وہ ابھی اسی کی مؤید ہے۔ سابقہ زمانوں میں پہاڑ۔ خلیجیں۔ سمندر۔ بڑے بڑے دریا اور گھنے جنگلات مختلف ملکوں اور قوموں کے درمیان روک تھے۔ اس وقت اگر مختلف قوموں میں منافرت بھی ہوتی تھی۔ تو ایسی ناقابل عبور قدرتی رکاوٹیں بچاؤ کا کام دیتی تھیں۔ عالمگیر پیمانہ پر ایک دوسرے پر یورش نہیں ہو سکتی تھی۔ ریلوں قسم قسم کے سمندری جہازوں اور ہوائی جہازوں کے وجود میں آنے سے تمام روکیں اٹھ گئی ہیں۔ اور تمام قومیں اپنے آپ کو کھلے میدان میں پاتی ہیں۔ اب دو ہی صورتیں ہیں یا مختلف قوموں۔ وطنوں۔ اور مذہبوں میں سمجھوتہ ہو کر دوستانہ تعلقات پیدا ہوں۔ یا آپس میں لڑ لڑ کر ساری نسل انسانی تباہ ہو جائے۔ ان روکوں کے اٹھ جانے سے جہاں باہمی

a super human species

حملے آسان ہو گئے ہیں۔ باہمی میل ملاپ کی آسانیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ چھاپہ خانہ۔ تار برقی ٹیلیفون اور ریڈیو نے ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھنے کے ذرائع بہم پہنچا دیئے ہیں۔ اگر دو شخص آپس میں ناراض ہوں اور انہیں آپس میں ملنے کا موقعہ نہ ملے۔ تو ان کے بغض اور نفرتیں اپنی اپنی جگہ پرورش پاتی رہتی ہیں۔ اگر میل ملاپ کے موقعے ملتے رہیں تو آخر ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے لگتے ہیں۔ اور نفرتیں پہلے کم اور پھر دور ہو جاتی ہیں۔ اس زمانہ میں جغرافیہ کی دیواروں کا جو قوموں کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ کر رہی تھیں گر جانا بغض و نفرت کی دیواروں کے جو قوموں اور وطنوں کے دلوں کے درمیان ہیں اور انہیں ملنے نہیں دیتیں۔ گر جانے کا پیش خیمہ ہے۔ موجودہ زمانہ ایسا ہے۔ کہ بالنسل انسانی متحد ہو یا اس کی خبر نہیں۔ اور اس کے متحد ہونے کے امکانات روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ بلکہ دنیا جنگ سے تنگ آئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہر طرف اتحاد کی پکار ہے۔ اور اتحاد کی تجویزیں ہیں

بعض احباب پوچھتے ہیں جب اتحاد عالم ہو جائے گا اس کے بعد جد و جہد کس چیز کے لئے ہو گی۔ اور اگر جد و جہد باقی نہ رہی تو زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے اور جد و جہد کے بغیر کوئی زندگی نہیں۔ انسانی جد و جہد کے لئے ہر قدم پر نئے مشاغل نکل آتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ انسان ہتھیاروں کا استعمال نہ جانتا تھا۔ غاروں میں

رہنما تھا سفر کی بے حد مشکلات تھیں اور سمندر سامنے آ جائے تو انسان کی دنیا ختم ہو جاتی تھی اس وقت ان کمیوں کو پورا کرنے کے لئے جدوجہد کرتا تھا۔ آج وہ کمیاں پوری ہو گئی ہیں تو جد و جہد کے لئے نئے میدان نظر کے سامنے کھل گئے ہیں۔ اسی طرح جب اتحاد عالم ہو جائے گا نہ معلوم قوائے عالم کی تسخیر کی کون کونسی مصروفیتیں نکل آئیں گی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ صحیح معنوں میں عالم اسی وقت سے ترقی کرلے گا۔ اس وقت تک تو انسان کو یا ہمی جنگ و جدال سے ہی فرصت نہیں ہوئی عالم میں ایسی ترقیات کے امکانات مخفی ہیں، کہ جن کی کوئی انتہا نہیں۔ اور یہ راستہ گول ہے۔ ہر قدم پر انسان صرف اگلی منزل ہی دیکھ سکتا ہے۔ ہاں جب وہاں پہنچتا ہے۔ تو ایک اور منزل روشن ہو جاتی ہے۔ پھر وہاں تک پہنچنے کی جد و جہد میں لگ جاتا ہے۔ علےٰ ہذا۔ اس ڈر سے کہ اگر متحد ہو گئے تو پھر کیا کریں گے۔ مصروف فساد نہیں رہنا چاہیئے۔ فساد کوئی اچھا شغل نہیں۔ متحد ہو جائیں گے تو اس سے بدرجہا اچھے شغل جد و جہد کے لئے مل جائیں گے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ ترقی کے لئے مقابلہ کی ضرورت ہے لیکن کیوں ساری نسل انسانی کی بھلائی کے کاموں میں اور ہنیں انہیں علمی تحقیقاتوں میں مقابلہ نہ کیا جائے اگر فساد میں مقابلہ ہو سکتا ہے تو تعمیری کاموں میں کیوں مقابلہ نہیں ہو سکتا؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جنگوں سے بڑی علمی ترقیات

ہوئی ہیں بظاہر یہ درست ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے گا تو وہ ترقیات جو جنگوں کی وجہ سے ہوئی ہیں وہ بھی تفرقہ کی نہیں بلکہ اتحاد کی پیداوار ہیں۔ ایک قوم کی جب دوسری سے جنگ ہوئی تو دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل قوت بہم پہنچانے کے لئے متحد ہونا پڑا۔ اس اتحاد کی برکت سے جو جنگ کی خاطر کرنا پڑا علمی ترقیات ہوئی ہیں۔ تو خیال کرنا چاہیئے کہ اگر ساری نسل انسانی متحد ہو جائے اور وہ قوت اور ذرائع بھی جو آپس کی جنگ میں برباد ہو رہے ہیں۔ تعمیری کاموں اور علمی تحقیقاتوں پر صرف ہوں تو کس قدر ترقیات ہوں گی۔

یہ سب بہانے ہیں جو انسان اپنے ضمیر کی ملامت سے بچنے کے لئے بناتا ہے اصل وجہ باہمی اعتماد کی کمی ہے اگر باہمی اعتماد کسی طرح سے پیدا ہو جائے تو دنیا دم نقد بہشت بن جائے

ایمان:۔ "یؤمنون بالغیب" مومن غیب پر ایمان لاتے ہیں غیب وہ ہے جو سامنے نہیں۔ سامنے کیا ہے؟ بدی کا دور دورہ۔ سو مومن وہ ہے جو بدی کے زور سے جو سامنے ہے بد دل ہو کر نیکی کے وجود کا جو سامنے نہیں انکار نہ کرے۔ کوشش کرتا رہے اور بالآخر اپنی کوششوں کے کامیاب ہو جانے یعنی نیکی کے پردۂ غیب سے نکل آنے اور بدی پر غالب آ جانے پر یقین رکھے "وبالآخرۃ ھم یوقنون"۔ جو شخص ہر جگہ بدی کے زور اور تسلط کو دیکھ کر آخرکار نیکی کے قائم ہو جانے سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اور خیال کرتا ہے۔ کہ کب اور کس طرح بدی کا

یہ زور ٹوٹے گا اور نیکی قایم ہو گی وہ مؤمن نہیں۔ سو فساد کا خاتمہ اور اتحاد کا دور دورہ جلد ہو یا دیر سے۔ نیکی کی قوت پر اعتماد رکھنے والوں اور نسل انسانی کے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ بدی سے مرعوب نہ ہوں۔ اور نیکی کے لئے کامیابی کے پورے یقین کے ساتھ لگاتار کوشش کرتے رہیں۔ اعتماد کی کمی جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ایمان سے ہی پوری ہوتی ہے بلکہ ایمان اسی اعتماد کا نام ہے۔

۹۔ موت اور بعد الموت

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ثبات خالص ایک کو ہے۔ اور کثرت جو وحدت کے ظہورات کا نام ہے۔ ہر آن معرض فنا میں ہے کثرت میں بے جان مادہ۔ نبات اور حیوان وغیرہ سب کچھ شامل ہے۔ نبات اور حیوان کو ہم زندہ کہتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں احساس وحدت بے جان مادہ سے زیادہ ہے۔ وہ بے جان مادہ کی نسبت وحدت کے زیادہ قریب ہے۔ انسان کی ہستی حیوان سے بھی اوپر مانتے ہیں کیونکہ وہ وحدت کے اور قریب ہو گیا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ نیستی خالص ایک سے جس کو ثبات ہے۔ دوری کا نام ہے۔ اور ہستی اس کے قرب کا۔ یہ نہیں کہ ہستی نیستی سے دوری ہے۔ اور ہستی نیستی کا قرب۔ کیونکہ وجود کل ایک ہے نیستی کا کوئی وجود نہیں۔ یہ تو صحیح ہے کہ

نیستی منفی ہستی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ ہستی منفی نیستی ہے واقعہ میں ہستی منفی ہستی ہے۔ لیکن انسان چیزوں کا تصور کرتے وقت نیستی کو بھی بجائے خود ایک ہستی خیال کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہستی منفی نیستی ہے۔ یہ واقعہ کے خلاف ہے اس سے انسان کو دھوکا لگتا ہے۔ کہ گویا زندگی کے مقابل موت کا۔ نیکی کے مقابل بدی کا۔ سچ کے مقابل جھوٹ کا۔ کمال کے مقابل نقص کا۔ روشنی کے مقابل تاریکی کا اور خدا کے مقابل شیطان کا کوئی وجود ہے۔ حالانکہ وجود صرف زندگی کا۔ نیکی کا سچ کا۔ کمال کا۔ روشنی اور خدا کا ہے۔ اور ان سب سے مراد خالص ایک ہے۔ موت زندگی کے نہ ہونے کا نام ہے۔ بدی نیکی کے نہ ہونے کا نام ہے۔ نقص کمال کے نہ ہونے کا نام ہے۔ اور نہ ہونا نیستی کو کہتے ہیں۔ اس واسطے موت۔ بدی۔ جھوٹ۔ نقص تاریکی اور شیطان سب نیست ہیں[ل] ان کا کوئی وجود نہیں۔

کثرت فانی ہے۔ یعنی بدلتی رہتی ہے۔ پہلے بے جان مادہ تھا۔ بیجانی چلی گئی اور زندگی آگئی۔ پھر نباتی زندگی چلی گئی اور ترقی یافتہ حیواتی زندگی آگئی۔ اس کے بعد حیواتی زندگی چلی گئی اور انسانی زندگی آگئی پہلی حالت کا چلا جانا فنا ہے پہلی فنا کا اثر بے جان مادہ پر یہ ہوا۔ کہ اس میں زندگی

ل چونکہ انسان کے زندگی۔ نیکی۔ سچ۔ کمال۔ روشنی اور خدا کے تصورات بھی اس کے نیستی کے موہوم تصور سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے انسان کے سارے کے سارے تصورات نیست ہیں۔ اور ہست وہی خالص ایک ہے جس کا وہ تصور نہیں کر سکتا

نمودار ہوگئی۔ دوسری فناد کا اثر یہ ہوا کہ زندگی ترقی کر گئی تیسری فنا کا اثر یہ ہوا کہ زندگی اور ترقی کر گئی۔ تو فنا یا موت زندگی کی ترقی کا نام ہے جس موت سے اب ہم ڈرتے ہیں۔ وہ ہماری مزید ترقی کا نام ہے۔ وہ جوہر جو آگے چل کر انسان بنا جب وہ بے جان مادہ سے رخصت ہوکر نبات میں آیا۔ اس روز اگر بیجان مادہ کے زبان ہوتی تو وہ ماتم کرتا۔ اسی طرح جب نبات اس کے شرف صحبت سے محروم ہوئی۔ اس نے اس کے چلے جانے کا ماتم کیا۔ اور پھر انسان بنا تو حیوان نے اس کی جدائی کا ماتم کیا۔ وہ جوہر تو ہر آن ترقی کرتا گیا لیکن جو اس سے محروم ہوتا گیا وہ اس کی جدائی کا یا اپنی موت کا ماتم کرتا رہا۔ اسی طرح اب جو انسان مرجاتا ہے وہ تو اور ترقی کر جاتا ہے پس ماندگان اس کی جدائی کا ماتم کرتے ہیں۔ ہمارے اندر جو چیز موت سے ڈرتی ہے وہ انسانیت نہیں بلکہ ہمارا حیوانی حصہ ہے جو انسانیت کے چلے جانے پر اپنی موت سے ڈرتا ہے۔ اسی لئے جس میں انسانیت پختہ ہوچکی ہوتی ہے۔ وہ موت سے نہیں ڈرتا۔

ہر کام کا ایک وقت ہے۔ اور ہر چیز کا ایک نتیجہ۔ علت و معلول کا ایک سلسلہ ہے جس کی ہر کڑی اپنے سے پہلی کڑی کا نتیجہ ہے اور آیندہ کڑی کا سبب۔ جو ماں کے پیٹ سے صیح قوا لے کر نہیں آیا۔ اسے یہاں مشکلات کا سامنا ہے۔ مثلاً مادر زاد اندھے کو جس نے بچپن میں تربیت و تعلیم حاصل کرلی وہ آیندہ زندگی کے لئے تیار ہوگیا۔ اور اس کی جوانی کی زندگی خوب مزے

سے گذرے گی لیکن جس نے بچپن میں کچھ نہیں سیکھا اس کی باقی عمر افلاس میں گذرے گی۔ جس نے جوانی میں بڑھاپے کے لئے کچھ پس انداز نہیں کیا بڑھاپے میں اسے اپنی جوانی کے زمانہ کی بے احتیاطی اور فضول خرچی کا خمیازہ اٹھانا ہے جس طرح انسان کی جوانی کی حالت اس کے بچپن کی پیداوار ہے۔ اسی طرح انسان کی آیندہ زندگی اس کی موجودہ زندگی کی پیداوار ہے۔ جو بچپن میں جوانی کے لئے تیار ہوگیا اسے جوانی میں مزہ ہے۔ جس نے جوانی میں بڑھاپے کا سامان کرلیا۔ اُسے بڑھاپے میں کوئی محتاجی نہیں۔ جس نے بچپن کا وقت ضایع کیا۔ اور کچھ سیکھا سمجھا نہیں۔ اس کی باقی عمر برباد اور جس نے جوانی میں اپنے بڑھاپے کے لئے تیاری نہیں کی اس کی پیری بھی خراب۔ اسی طرح جو شخص اس زندگی میں جو تیاری اسے آیندہ زندگی کے لئے کرنی چاہیئے کرچکا اس کی انسانیت پختہ ہوگئی اور اس کو موت کا کچھ ڈر نہیں۔ جس نے ایسی تیاری نہیں کی اس کا خوف بجا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ انسان کا حساب ساتھ کے ساتھ ہوتا اور چکایا جاتا رہتا ہے۔ انسان کا ہر قول و فعل اور سکون و حرکت اس پر ایک اثر چھوڑتا جاتا ہے۔ یہ اثر پہلے قول و فعل کا نتیجہ ہے اور خود آیندہ قول و فعل کا سبب۔ نیکی سے مزید نیکی کی قوت پیدا ہوتی ہے اور بدی سے مزید بدی کی۔ جس طرح انسان اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لینا چھوڑ دے تو ان میں کام کی قابلیت کم ہو جاتی ہے یا بالکل جاتی

رہتی ہے اسی طرح نیکی ترک کرنے سے نیکی کی طاقت زائل ہو جاتی ہے اور جھوٹ سے سچائی کی۔ ہوتے ہوتے ایسا ہو جاتا ہے۔ کہ نہ صرف انسان خود نیکی نہیں کرتا اور سچ نہیں بولتا بلکہ اس کے اندر سے نیکی اور راست بازی کو سمجھنے اور اس کی داد دینے کی قوت بھی جاتی رہتی ہے۔ یہ وہ حالت ہے جس کو قرآن نے دلوں پر مہر لگ جانے سے تعبیر کیا ہے۔ اس وقت انسان یہی سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ ٹھیک کر رہا ہوں۔ اس وقت مثلاً اگر وہ کہتا ہے۔ کہ مجھے پیغمبر میں سچائی نظر نہیں آتی۔ تو ٹھیک کہتا ہے۔ بیشک اُسے نظر نہیں آتی۔ کیونکہ وہ بینائی کھو چکا ہے۔

ہر بدی سے انسان کے دل کا شیشہ مکدر ہوتا رہتا ہے اور نیکی سے صاف۔ گویا جمع و تفریق ساتھ کے ساتھ ہو کر نتیجہ ہر آن تیار رہتا ہے جب چاہے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے۔ انسان کے اس جہان سے رخصت ہونے کے وقت جو حالت اس کے آئینہ قلب کی ہوتی ہے وہی اس کے زندگی بھر کے حساب و کتاب کا نتیجہ ہے۔ جو وہ ساتھ لے جاتا ہے۔ انسان اپنا بہشت و دوزخ یہاں خود تیار کرتا رہتا ہے اور جاتا ہوا جو کچھ تیار کیا ہو ساتھ لے جاتا ہے۔ جو کچھ وہ ساتھ لے جاتا ہے وہ اس کی اس دنیا کی کمائی ہے۔ اور اگلی دنیا کے لئے سرمایہ جس سے اس نے وہاں کام شروع کرنا ہے جو نسبت اس جہان کو ماں کے پیٹ سے ہے۔ جہاں سے انسان یہاں آیا

ہے۔ وہی نسبت اگلے جہان کو اس جہان سے ہے۔ وہ جہان اسی نسبت سے بمقابلہ اس جہان کے وسیع ہے۔ اور وہاں بے انتہا ترقیات کا میدان ہے۔

۱۰۔ تقدیر یا قسمت

فرض کرو کہ ا ، ب ایک کام کرنا چاہتا ہے اور ب چاہتا ہے کہ نہ کرے۔ ا کی آزادی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے راستہ سے روک کو دور کر دے اور ب کی آزادی اس میں ہے کہ وہ اپنا راستہ صاف کر لے۔ آزادی کی خاطر یا دونوں مر جائیں گے یا ایک اگر ایک مرا تو جو بچ گیا کل کو اس کی کسی اور آزادی پسند سے چپقلش ہو جائے گی اور اس میں وہ مارا جائے گا علٰی ہذالقیاس۔ یہ اچھی آزادی ہوئی کہ آزادی پسندوں کو بھی ساتھ لے ڈوبی ع

دھبہ رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

آزادی کی ایک ہی صورت ہے کہ ا ب ج وغیرہ سب کو کہا جائے کہ تم میں سے ہر ایک اپنے اپنے فایدہ اور اپنی اپنی پسند کی کوشش کرنے کے لئے آزاد ہے سوا ایسی کوشش کے جس سے دوسرا کو نقصان پہنچے۔ اس سے آزادی پر حدبندی تو لگ گئی لیکن سب کی جانیں بچ گئیں اور اپنے اپنے فایدہ کی جائز کوشش کے لئے سب آزاد بھی ہو گئے۔ ورنہ آزادی تو درکنار جان بھی چلی

تھی۔ پس آزادی پر آزادی کی خاطر حد بندی لگانا ضروری ہے یہ ایسی حد بندی ہے جو انسان کو اپنی سلامتی کے لئے اپنے آپ پر خود لگانا چاہیئے۔ چونکہ یہ اس کی اختیاری ہے کبھی اس کا خیال رکھتے کبھی توڑ دیتا ہے اور دنیا میں جو فساد اور دکھ ہے وہ اس حد بندی کو توڑنے کی وجہ سے ہی ہے۔

اس دائرہ کے باہر جس میں انسان کو اپنے پر آپ حد بندی لگانا چاہیئے قدرت نے ہر چیز کی حدود خود مقرر کر دی ہیں جنہیں توڑنا ممکن نہیں ان حدود کا نام تقدیر ہے۔ ہر چیز کو اس کا دائرہ عمل بانٹ دیا گیا ہے تاکہ نہ یہ دوسرے کے دائرہ میں دخل دے نہ وہ اس کے دائرہ میں۔ سورج کی اپنی جگہ مقرر ہے زمین، چاند وغیرہ سیاروں کے اپنے اپنے راستے مقرر ہیں اگر یہ راستے مقرر نہ ہوں تو مختلف کروں کے ہر وقت تصادم (ٹکراؤ) ہوتے رہیں۔ ہم جو معلوم کر لیتے ہیں کہ مثلاً کل کتنے بجے سورج نکلیگا؟ اور کتنے بجے غروب ہوگا؟ فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ کو رات کتنی لمبی ہوگی اور دن کتنا لمبا؟ سورج گرہن کب ہوگا اور چاند گرہن کب؟ تو یہ سب سورج، چاند وغیرہ کے مقررہ رفتاروں سے مقررہ راستوں پر چلنے یا ان کی تقدیروں کی بدولت ہے ایک بیماری کے لئے ہم ایک دوائی استعمال کرتے ہیں اور دوسری کے لئے دوسری۔ یہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ تمام دواؤں کی تاثیریں مقدر یا مقرر ہیں۔ جب سیلاب آتا ہے ہم اونچی جگہ چڑھ جاتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ پانی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ نیچی

میں نہ ہے نہ کہ بلندی کی طرف ۔ بجلی سے بچاؤ کے لئے ہم پاؤں کے نیچے لکڑی رکھ لیتے ہیں اس طریق سے ہم بجلی کے دائرہ عمل سے جو اس کی تقدیر ہے ۔ باہر ہو جاتے ہیں ۔ اگر کسی شخص کو صندوق میں بند کر دیا جائے تو ہم پہلے سے بتا سکتے ہیں کہ وہ مر جائے گا کیونکہ انسانی زندگی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ آکسیجن کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی ۔ اگر ہم کمرہ کی سب کھڑکیاں بند کر دیں تو کمرہ اندھیرا ہو جاتا ہے کیونکہ روشنی کی تقدیر یہ ہے کہ وہ اینٹ پتھر کی دیواروں سے پار نہیں جا سکتی ۔ اگر ہم بہت زیادہ کھا جائیں تو پیٹ میں درد ہونے لگتا ہے ۔ کیونکہ معدہ کے لئے جو اندازہ مقرر تھا اس سے زیادہ اس میں ڈال دیا گیا ہے اگر ہم لگاتار بہت زیادہ کام کریں تو اس سے بھی بیمار ہو جاتے ہیں ۔ کیونکہ جسم پر اس کے اندازہ یا تقدیر سے زیادہ بوجھ ڈالا گیا ہے اگر ہم عیاشی کریں تو جلد کمزور ہو جاتے ہیں ۔ اور طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ کیونکہ ہر چیز کا اندازہ مقرر ہے جس میں کمی بیشی سے خرابی ہوتی ہے ۔ اگر ہم ہاتھ پاؤں سے کام لینا چھوڑ دیں تو وہ بے کار ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح اگر ہم نیکی کی قوت سے کام لینا چھوڑ دیں تو وہ زائل ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ ہر چیز کے لئے مقرر ہے کہ وہ اپنا مقررہ کام کرتی رہے تو ٹھیک رہتی ہے ۔ نیکی سے مزید نیکی کی طاقت پیدا ہوتی ہے ۔ اور بدی سے بدی کی

گندم سے گندم اگتی ہے اور جو سے جو کیونکہ ہر چیز کا فعل اور اس کا نتیجہ مقرر ہے جیسے دواؤں کی تاثیریں ہیں اسی طرح غذاؤں کی، معاشرت کی، سوسائٹی کی تاثیریں ہیں۔ جیسے مادی تاثیریں ہیں ویسے ہی ذہنی، اخلاقی، روحانی تاثیریں بھی ہیں بر منبہ تقدیریں ہیں۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اپنے آباؤ اجداد کی غذاؤں کی، معاشرت کی، سوسائٹی کی ہزار در ہزار مادی، ذہنی اخلاقی اور روحانی تاثیروں کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہی تاثیریں اس بچہ کی تقدیر بناتی ہیں اسی لئے کوئی جسمانی طور پر کمزور ہوتا ہے کوئی طاقتور کوئی بہت ذہین کوئی کم۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ کیوں ایک شخص کو ایک قسم کے حالات میسر آئے اور دوسرے کو دوسری قسم کے؟ شخص تو خود ابھی حالات کے نتیجہ میں بر آمد ہوا ہے حالات سے الگ پہلے سے تو کوئی شخص موجود نہ تھا کہ اس پر ایک قسم کے حالات وارد کئے گئے یا دوسری قسم کے۔ اصل اعتراض دنیا میں اختلاف حالات اور کثرت اشیاء کے وجود پر ہے۔ فرض کیا کہ سب کو یکساں جسمانی طاقت اور مال و دولت کے ذرائع دیئے گئے پھر سوال ہوگا کہ ایک زیادہ خوبصورت کیوں اور دوسرا کم کیوں؟ سب کو اعلےٰ درجہ کے محل رہنے کے لئے دے دیئے گئے اب آ کہیگا کہ مجھے ب والا محل کیوں نہیں ملا اور ب کہیگا کہ جب

تو میرے والا محل پسند کرتا ہے تو میں اسے کیوں چھوڑوں؟
دولتمند کہیگا کہ اگرچہ مجھے بہت بڑا دولت مند بنایا گیا ہے پر بادشاہ نہیں بنایا گیا۔ بادشاہت کے سامنے گھر کی امیری کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اگر سب بادشاہ ہو جائیں تو رعایا کوئی بھی نہ ہو۔ رعایا نہ ہو تو بادشاہ کاہے کا؟ سب کی طبعیتیں ایک ہوں تو مثلاً سب کہیں گے کہ ہم میز کرسی پر بیٹھ کر ادبی کام کریں گے ہم گردوغبار میں ہل جوتنا پسند نہیں کرتے۔ چلو فیصلہ ہوا غلہ پیدا کرنے کے لئے کوئی بھی نہ رہا اب یہ میز کرسی والے کھائیں گے کیا؟ "سب یکساں ہوں" اس فقرہ کے معنی صرف یہ ہیں کہ کل ایک ہی ہو دوسرا کوئی نہ ہو۔ کیونکہ لفظ دوسرا تو اسی وقت استعمال ہوگا جب اس دوسرے میں پہلے سے کوئی نہ کوئی فرق ہو جس کی بنا پر یہ اس سے الگ ہو اور دوسرا کہلائے۔ 'اختلاف نہ ہو' کے معنی ہیں کہ 'دنیا نہ ہو'۔

ایک سوال بیشک رہ جاتا ہے کہ انسان کو ان حالات پر جن کا وہ نتیجہ ہے قابو نہ تھا جب اس کی پیدائش کے موجب اور اس کی قابلیتیں مقرر کرنے والے حالات پر اسے قابو نہ تھا تو اب جو کچھ وہ کرتا ہے اس کے لئے اسے ذمہ دار کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟ انسان کو پیدا کرنے والے حالات

کی جہاں اتنی تاثیریں اور خاصے ہیں وہاں ان کی ایک تاثیر یہ بھی ہے کہ انسان صاحب ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اس ارادہ کی بھی بیشک تقدیر ہے یعنی اس کی حدیں مقرر ہیں۔ اس کے علاوہ انہی حالات سے جن پر اسے قابو نہ تھا انسان میں دکھ سکھ کی حس پیدا ہو جاتی ہے جس سے اسے ایک راستہ کے غلط یا صحیح ہونے کی پہچان میسر آجاتی ہے۔ انسان کو صرف اس عمل کے لئے ذمہ وار ٹھہرایا جاتا ہے جس کے کرنے یا اس سے باز رہنے کا اس میں مادہ ہے جو اس کے ارادہ کی حدود میں ہے اور جس کے غلط یا صحیح ہونے کی اسے پہچان بھی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ انسان کئی دفعہ اپنے بعض کاموں کی وجہ سے خود ہی اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے کہ تو نے یہ کیوں کیا؟ اگر واقعی ان میں اس کے ارادہ اور اختیار کو کوئی دخل نہ ہوتا۔ تو وہ اپنے آپ کو ان کے لئے ملامت نہ کرتا۔ جس کے پاس دولت نہیں اسے حاجتمندوں پر دولت خرچ نہ کرنے کی وجہ سے نہ کوئی باز پرس ہوتی ہے نہ ملامت۔ جو کچھ انسان کی طاقت میں ہے اور اپنے ارادہ سے کرتا ہے یا کرنے سے باز رہتا ہے اور خود ہی اس کے کرنے یا نہ کرنے پر اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا ہے اسی کے لئے اسے ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ انسان کی ذمہ داری [illegible]

کے اندر ہے جس میں قدرت نے اسے با اختیار کیا ہے اور جیسا میں جیسے کہ پہلے ذکر ہوا انسان کو اپنی سلامتی کے لئے اپنے آپ پر خود حد بندی لگانا چاہیئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ انسان ایسی حد بندی اپنے آپ پر لگانے میں قاصر رہتا ہے اور اس سے فساد ہوتا ہے۔ یہ حد بندی بھی قدرت کو ہی لگا دینا چاہیئے تھی تاکہ انسان اسے توڑ نہ سکتا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو انسان نہیں ہونا چاہیئے تھا بلکہ زمین، سورج، چاند کی طرح مجبور ہونا چاہیئے تھا۔ گویا ساری کائنات کا بادشاہ یہ گلا کر رہا ہے کہ مجھے ایک ادنےٰ چپراسی کیوں نہیں بنایا گیا؟ تو میرے اختیار میں کچھ ہوتا نہ میں خرابی کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان ہوتا ہی نہ۔

شاید بعض اصحاب پوچھیں گے کہ اگر سب کو خوشحال رکھنا ممکن نہ تھا تو دنیا بنائی ہی نہ ہوتی۔ پیدا کر کے لوگوں کو مصیبت میں ڈال دینے کے کیا معنی؟ سو واضح رہے کہ جہاں ہر چیز کسی کو کم ملی ہے کسی کو زیادہ خوشی کا سرمایہ سب کو یکساں ملا ہے ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے امیر کا ہو یا غریب کا۔ خوبصورت ہو یا بدصورت۔ ذہین ہو یا کند ذہن۔ اپنے پہلو میں ایسا دل لاتا ہے جو خوشی سے لبریز ہے۔ خوشی جو اس میں سما نہیں سکتی بچے کے چہرے پر یہ نکلتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کا بھولا بھالا غم سے ناآشنا

ہنستا ہوا مکھڑا ایک غمگین شخص کے غم کو بھی وقتی طور پر بھلا دیتا ہے۔ اور وہ بھی بچہ کو دیکھ کر ہنس پڑتا ہے۔ جب بڑا ہوتا ہے تو خواہ بادشاہ ہو وہ خوشی باقی نہیں رہتی اگر خوشی کا دارومدار مال و دولت پر ہوتا تو کوئی دولت مند کبھی غمگین نہ ہوتا۔ اور اگر اس کا دارومدار جاہ و جلال پر ہوتا تو کوئی حکمران کبھی غمگین نہ ہوتا۔ خوشی گناہ سے پاک فطرت کی پیداوار ہے جب بچہ پیدا ہوتا ہے فطرت پر ہوتا ہے۔ بے گناہ ہوتا ہے اس واسطے بے حد خوش ہوتا ہے۔ بڑا ہو کر جب فطرت سے گرتا ہے اس کا چین و اطمینان برباد ہو جاتا ہے۔ اور غمگین ہو جاتا ہے۔ پھر ایسے شخص کی طرح جس کی کوئی چیز گم ہو جائے تو ہر جگہ وہ اس کی تلاش کرتا ہے۔ اپنی خوشی کو جسے گم کر چکا ہے کبھی کسی چیز میں تلاش کرنے لگ جاتا ہے کبھی کسی میں مثلاً یہ سمجھ کر کہ خوشی مال و دولت میں ہے دھن پیدا کرنے کی دھن میں لگ جاتا ہے، جب دھن مل جاتا ہے، تو یہ معلوم کر کے کہ خوشی دھن میں نہیں عزت و مرتبہ میں ہے اسے تلاش کرنے لگ جاتا ہے جب وہ حاصل ہو جاتی ہے تو وہاں بھی خوشی سے مایوسی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر جگہ خوشی کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے اور نہیں جانتا کہ خوشی اپنی فطرت کی آواز پر قائم رہنے اور پاک زندگی بسر کرنے میں ہے خواہ وہ کتنی ہی غریبی کی زندگی کیوں

نہ ہو دنیا ایک سینما کی طرح ہے سینما میں ایک شخص بادشاہ کا پارٹ ادا کرتا ہے اور دوسرا پولیس کانسٹبل کا۔ کمپنی کے مالک کی نظر میں کنسٹبل کا پارٹ کرنے والا جو اپنے پارٹ کو خوبی سے نباہتا ہے بادشاہ کا پارٹ کرنے والے سے جو اس میں فیل ہوتا ہے بہت زیادہ عزیز ہے۔ سو ہر انسان کو جو پارٹ سپرد کیا گیا ہے اگر اس نے اسے پوری کوشش سے مالک کی مرضی کے مطابق نباہ دیا تو وہی سب سے زیادہ خوش قسمت ہے مالک کی نظر ہر شخص کے اپنے دائرہ میں اس کی کارکردگی پر ہے۔ دائرہ کی بڑائی چھوٹائی یا اونچائی اور نیچائی پر نہیں۔

دو صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کرنی چاہیے اور جو صورت اختیار کی جائے اسے نباہنا چاہیے۔ یا تو یہ ماننا چاہیے کہ انسان کی اپنی کوئی ہستی نہیں وہ محض ایک مشین ہے جو چلانے والے کے تابع رہا ہے۔ جدھر وہ چلاتا ہے یہ چلتی ہے۔ اس صورت میں انسان کو گلہ نہیں ہونا چاہیے جیسے مشین کو کوئی گلہ نہیں ہوتا جب ہستی ہی نہیں تو گلہ کس کو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اپنی ہستی کو مانے اگر یہ صورت اختیار کی جائے تو اسے اپنے ارادہ سے کئے ہوئے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنا چاہیے۔ مشکل یہ ہے کہ نہ انسان اپنی ہستی اور ارادہ سے دست بردار ہونا چاہتا ہے نہ ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ ارادہ اور اختیار جو انسان کو حاصل ہے اسے دیا گیا ہے۔ اس کا اپنا نہیں

لیکن اب وہ اس کی اپنی چیز ہے۔ یہ اس لئے اسے دیا گیا اور اس
کی ملک بنایا گیا ہے کہ اگر وہ چاہے کہ دینے والے پر کچھ نثار کرے
تو اس کے پاس نثار کرنے کو کوئی چیز ہو جسے وہ اپنی سمجھ کر نثار
کر سکے یعنی صاحب ارادہ و اختیار ہوتا ہوا اپنے ارادہ و اختیار
سے دست کش ہو کر اپنے آپ کو بے اختیار مشین بنا دے جو
چلانے والے کی مرضی اور ارادہ کے بغیر حرکت نہیں کرتی۔ جو
لوگ اپنے ارادہ و اختیار کو یوں مالک کے قدموں پر نچھاور
کر کے خود ایک مشین بن جاتے ہیں ان کے اعمال کی ذمہ داری
بے شک ان پر نہیں بلکہ ان کے چلانے والے پر ہے اور وہ اس
ذمہ داری کو پوری طرح قبول کرتا ہے ان کی ہر حرکت و سکون
کو اپنی حرکت و سکون قرار دیتا ہے اور ان کے قول و فعل کو سچائی
اور نیکی کا معیار ٹھیراتا ہے۔ انسان کو کرنا تو یہی چاہیئے کہ اپنی ہستی
کا قائل نہ ہو ہستِ صرف اسی کو سمجھے اور اپنے آپ کو مشین کی
طرح اس کے ارادہ کے تابع کر کے تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش
ہو جائے۔ لیکن اگر وہ اپنی ہستی کو سمجھتا ہے تو پورے طور
سے سمجھے۔ اپنے آپ سے وفاداری کرے اور اپنے آپ کو اپنے
آپ کے سامنے جواب دہ سمجھے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو جلد ہی اسے
معلوم ہو جائے گا کہ پھر وہ مشین بن کر رہ گیا ہے۔ جو اپنے اندر کی
آواز کے تابع ہے۔ نیز یہ کہ اس کی ہستی مالک کی ہستی سے الگ

نہیں اس کی ہستی مالک کی ہستی کا ظل ہے اور اس کا ارادہ مالک کے ارادہ کا پرتو اور اس کے اندر کی آواز مالک کی آواز۔ غرض یہ سوال کہ انسان مجبور ہے یا مختار اسی وقت تک ہے جب تک وہ اس دھوکا میں ہے کہ ہستیاں کئی ہیں۔ اور وہ بھی ایک علیحدہ ہستی ہے جب پردہ اٹھ گیا اور معلوم ہو گیا کہ ہستی کل ایک ہی ہے تو نہ جبر رہا نہ اختیار جب تک پردہ نہیں اٹھتا۔ اگر اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے تو اپنے مقام کو سمجھے اور صبر کی اختیار کرے۔ اور اگر مختار سمجھتا ہے تو اس پر پکا رہے غیر سے (جو اس کی نفسانی خواہشات ہیں) مغلوب نہ ہو اور تمام اختیار ہاتھ سے نہ دے۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی رہیگا

ارادہ انسان کو اس لئے نہیں دیا گیا کہ اس سے وہ مالک کا مقابلہ کرے۔ بلکہ اس لئے کہ مجبوری سے نہیں بلکہ رضا و رغبت سے اسے مالک کے قدموں پر نچھاور کردے۔ جو اس طرح کرتا ہے۔ مالک اسکا ہو جاتا ہے۔ گویا مالک خود ہی اپنے پاس سے ایک چیز دیتا ہے کہ یہ مجھے نذر کے طور پر پیش کرنا پھر اس نذر کو بندہ کی طرف سے سمجھ کر اور اس سے خوش ہوکر اپنے آپ کو انعام میں دے دیتا ہے۔ یہ مہربانی کی حد ہے۔ ایسے مالک کے بارہ میں بدظنی کرنا کہ اس نے بے انصافی کی ہے۔ یا آئندہ سختی کا برتاؤ کرے گا اور ایسی لغزشوں کے لئے سزا دیگا جو واقعی ہماری طاقت سے باہر تھیں۔ ناشکری کی حد ہے۔ افسوس جتنا وہ اس سے محبت کرتا ہے اتنا ہی یہ اس سے بدظن ہے۔

خاتمہ

میں لکھ چکا ہوں کہ حقیقت عالم انسان ہے۔ اور انسان سے وہی ظاہر ہوتا ہے۔ جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ انسانوں میں مدارج ہیں۔حق و باطل کا معیار انسان کامل ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں انسان کامل کی تعلیم کا منشا یہی ہے جو اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ تمام پیغمبر، رشی، منی اور اوتار انسان کامل ہیں۔ اگرچہ میں نے الہامی کتابوں سے عمداً بہت کم حوالے دیئے ہیں میرا یقین ہے کہ میرے تمام مضامین کو تمام مذاہب کے پیغمبروں اور ان کی الہامی کتابوں کی تائید و تصدیق حاصل ہے۔ میرے اس یقین کی بنیاد دو باتوں پر ہے:۔

(۱) قرآن شریف میں لکھا ہے کہ یہی تعلیم جو قرآن میں ہے پہلی کتابوں میں بھی تھی۔ اور ان ہی محکم کتابوں کا نچوڑ قرآن میں ہے ؎

(۲) جہاں تک مجھے دوسرے مذاہب کے متعلق معلومات

؎ فیہا کتب قیمۃ ؕ انہ لفی الزبر الاولین ؕ

حاصل کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ اس نے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ واقعہ میں تمام الہامی کتابوں کی بنیادی تعلیم ایک ہی ہے۔

اگرچہ یہ مضامین مجھے ساری الہامی کتابوں میں دکھائی دے رہے ہیں۔ میرے اندر ان کو بیدار کرنے کا باعث جناب بہاء اللہ ایرانی کی بعض کتابیں ہوئی ہیں جنہیں مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ آپ خدا کی طرف سے تربیت عالم کے کام پر مامور ہونے کے دعویدار ہیں۔ اور آپ کا پیغام اتحاد عالم ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ "بے شک یہ بندہ اس لئے بھیجا گیا ہے۔ کہ دنیا کو نئے سرے سے زندہ کر دے۔ اور زمین کی ساری آبادیوں کو متحد کر دے۔ خدا کا ارادہ پورا ہو کر رہیگا اور تو کرہ ارض کو چمکتی ہوئی بہشت پائے گا"

میری طبیعت اتحاد پسند واقع ہوئی ہے۔ اس لئے میں نے یہ حقیر کوشش اتحاد عالم کے لئے کی ہے۔ اور میرا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سمجھے اور اپنے آپ کو اس لڑائی و عناد کے جہنم سے جس نے اس کی زندگی کو تلخ کر رکھا ہے نکالنے کی کوشش کرے۔ ہم جھگڑتے رہتے ہیں کہ اگلی دنیا میں جہنم سے کیونکر بچ سکتے ہیں۔ اگلی دنیا میں تو جو ہوگا سو ہوگا اس جھگڑے سے ہم اپنی اس دنیا کو جہنم بنائے ہوئے ہیں ہمیں سب سے پہلے اس جہنم کو جو یہاں بنا ہے ٹھنڈا کرنا چاہیئے

اور یقین جانیئے کہ جو اس دنیا کے جہنم کو ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہوگیا اس کے لئے آگے کوئی جہنم نہیں۔ اور بفرض محال اگر کوئی ہوا بھی تو وہ اسے بھی ٹھنڈا کرلے گا۔ کیونکہ اسے جہنم کو ٹھنڈا کرنے کا ڈھنگ آچکا ہے۔ سو اگلی دنیا میں جہنم سے بچنے کے لئے اس دنیا کو دم لفظ جہنم بنا دینا اور اس میں داخل ہو جانا کوئی عقل کی بات نہیں۔ اور اگر آگا دنیا کی بھی بہت فکر ہے تو وہ اسی دنیا کا تسلسل ہے۔ یعنی جو یہاں سے ساتھ لے جائیں گے وہی وہاں ملے گا۔ جو یہاں بغض، عناد، بے انصافی اور جھوٹ کے جہنم میں ہے اس کے لئے وہاں بھی جہنم ہی ہے۔ قرآن میں ہے۔ جو یہاں اندھا ہے وہ آگے بھی اندھا ہوگا[1]

غرض خدا نے انسان کو جنت میں رہنے کے لئے بنایا ہے۔ یہاں بھی اور آگے بھی۔ اور اس کا راز وحدت انسانی میں ہے۔ انسان تفرقہ سے اپنی جنت کو جہنم بنا دیتا ہے تو خدا اس کو پھر اس کی کھوئی ہوئی جنت واپس دلانے کی تدبیر کرتا ہے۔ انسان بار بار جنت کو کھوتا ہے اور جہنم کو خریدتا ہے۔ اور خدا بار بار اسے جنت میں داخل کرنے کی کوشش میں ہے کہ جب تک انسان اپنے پاؤں آپ کلہاڑی مارتا رہیگا۔

[1] من کان فی ھذہ اعمیٰ فھو فی الاخرۃ اعمیٰ

"تربیتِ عالم"

مصنف کی دوسری کتاب "تربیت عالم" زیر طبع ہے، جو عنقریب مارکیٹ میں آ جائے گی، اس کتاب میں خدا کی تربیتِ عالم کی سکیم کو خالص مذہبی نقطۂ نظر سے بیان کیا گیا ہے۔ اور قرآن شریف کے متعدد اور مفصل حوالوں سے دکھایا گیا ہے کہ دین، شریعت، رسالت، قیامت، حشر نشر، حساب کتاب، مردوں کے جی اُٹھنے اور بہشت دوزخ سے جو قرآن کا منشا تھا اس کے سمجھنے میں لوگوں نے کیا غلطی کھائی ہے۔ اور حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان امور کو بیان کرنے سے کیا مدعا تھا، ہر مسلمان کے لئے جو قرآن کو رسمی طور پر نہیں بلکہ فی الحقیقت خدا کا کلام جانتا ہے، اور اس سے ہدایت کا طالب ہے، اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

اس کتاب کا مقصد بھی اتحادِ عالم ہے، اور اس میں تمام اہم مسائل کا جو اس وقت دنیا کو درپیش ہیں اصولی حل بتایا گیا ہے۔

کتاب کی ضخامت دو اڑھائی سو صفحہ ہو گی، اور اس

اس میں ناظرین کرام ایک فقرہ بھی ایسا نہ پائیں گے، جس میں کوئی نہ کوئی نئی بات نہ بتائی گئی ہو اور جو قرآن شریف کے عین مطابق نہ ہو۔ دوسری خصوصیت یہ ہے، کہ اس میں سارے قرآن شریف کا نچوڑ آگیا ہے۔

پبلشر (چودھری) محمد اسلم

(خلف چودھری عبدالرحمٰن)

پریم پرنٹنگ پریس جموں سے پبلشر نے (چودھری) محمد اسلم

۲۹۷۲۵ RR ع - ح

آخر درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت مین ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

کتب خانہ

جامعہ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس رفقاء، مجلس انتظامی
مجالس شعبہ جات و نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیہ جات ملحقہ و گزیٹیڈ عہدہ داران جامعہ
اور اراکین دار الترجمہ دس کتابیں ایک ماہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۳۔ طیلسانین رجسٹر شدہ دو کتابیں بی۔ اے۔ اور انٹرمیڈیٹ
کے طلبہ تین کتابیں ایم۔ اے۔ ایل ایل بی و تحقیقاتی جماعتوں کے
طلبہ پانچ کتابیں دو ہفتہ تک اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۴۔ مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہوں تو طلبہ سے بحساب
ایک آنہ یومیہ فی کتاب جرمانہ لیا جائے گا۔

۵۔ بشرط موجودگی کتابیں مکرر جاری کی جا سکیں گی مگر اس غرض کے
لیے کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶۔ کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو تشخیص پر ذمہ داری
عائد ہوگی۔

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان سیاہی یا پنسل سے
نہ لگایا جائے۔

۸۔ قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں
جاری نہ کی جا سکیں گی۔ فقط

ع - ح ۲۹۷۴۵

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ لیا جائیگا۔

			۲۳؍۹؍۵۰
			20 OCT 1950

کتب خانہ
جامعہ عثمانیہ

۱- اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس تعلیمات، مجلس انتظامی، مجالس شعبہ جات و نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکینگے۔

۲- اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیات متعلقہ و گزیٹیڈ عہدہ داران جامعہ دس کتابیں ایک ماہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکینگے۔ اور اگر ضرورت ہو اور اراکین دارالترجمہ مترجمہ شدہ دو کتابیں ایک ماہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکینگے۔

۳- طلبا ایم اے ال ال بی و تحقیقاتی جماعتوں کے طلبہ تین کتابیں دو ہفتہ کے لئے اپنے پاس رکھ سکینگے اور طلبہ بحساب طلبہ پانچ کتابیں مدت مقررہ کے لئے جاری کی جا سکینگی مگر اس غرض

۴- مدت مقررہ کے بعد کتاب واپس نہ کی جائے تو ایک آنہ یومیہ فی کتاب جرمانہ لیا جائیگا۔

۵- بشرط موقع کتابیں جاری کی جا سکینگی مگر کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶- کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو مستعیر پر ذمہ داری عائد ہوگی۔

۷- کتابوں پر کسی قسم کا نشان یا حاشیہ نہیں لگایا جائے۔

۸- قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں جاری نہیں کی جا سکینگی فقط